شخصیات اسلام

صلاح الدین سعیدی

ادارہ نوید سحر لاہور

انتساب

دادا مرشد حضرت سید خلیل احمد کاظمی محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام

نام کتاب	شخصیاتِ اسلام
مصنف	صلاح الدین سعیدی (ڈائریکٹر تاریخ اسلام فاؤنڈیشن لاہور)
پروف ریڈنگ	صلاح الدین سعیدی
صفحات	256
تاریخ اشاعت	4 جون 2010ء
ناشر	ادارہ نوید سحر، کاہنہ لاہور
قیمت	200/- روپے

ملنے کے پتے

حافظ امانت علی سعیدی، پرانا کاہنہ، ڈاکخانہ کاہنہ نو، ضلع لاہور۔ موبائل: 0300-8090476

مکتبہ مہریہ کاظمیہ ملتان۔ مکتبہ کریمیہ ملتان۔ مکتبہ فیضانِ سنت ملتان۔ مکتبہ نبویہ، قادری رضوی کتب خانہ، مکتبہ حنفیہ، ضیاء القرآن، کرمانوالہ بک شاپ، مکتبہ رضوان، ادارہ صراط مستقیم، روحانی پبلشرز گنج بخش روڈ، لاہور

سٹاکسٹ

النور پبلیکیشنز، فسٹ فلور، پنجاب پلازہ، اردو بازار، لاہور

فون: 042-37361378,0332-4716360

راہنمائی

دیباچہ

سعید بدر قادری (سینئر ایڈیٹر روزنامہ پاکستان، لاہور)

زیر نظر کتاب ''شخصیات اسلام'' صلاح الدین سعیدی کے رشحاتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب مختلف اوقات میں لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔

ان مضامین میں اُن مشاہیر اسلام کو اجاگر کیا گیا جنہوں نے روشنی و ہدایت کے چراغ روشن کئے، اپنے اپنے ادوار میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھایا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ پیغمبر، رسول نامدار و کامگار صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رُخ موڑا، صلاح الدین سعیدی نے ان پر قلم اُٹھایا ہے اور ان کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر نئی نسل کے سامنے لے آئے۔ اب یہ ہمارا کام ہے، ان بزرگ شخصیات کے کردار و اعمال اور افکار و خیالات سے مستفید اور مستفیض ہو کر دین و دنیا میں فیض و برکات حاصل کریں۔

جناب صلاح الدین سعیدی تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بزرگان دین و دنیا کے نقوش پا کو روشن کر دیا اور ان کو صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ زیر نظر کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف ان بزرگ شخصیات کا ذکر خیر ہے جو صفحۂ ہستی سے رخصت ہو چکی ہیں بلکہ بعض ایسی شخصیات کے حالات و واقعات اور افکار و خیالات شامل ہیں جو ابھی بقید حیات ہیں۔ اور ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

مجھے یقین کامل ہے کہ علم و حکمت کے موتیوں کے متلاشی اور اہل ذوق حضرات زیر نظر کتاب ''شخصیات اسلام'' کو مفید پائیں گے۔ صلاح الدین سعیدی نے شیخ سعدی شیرازی کے اس فرمان پر عمل کر دکھایا ہے۔

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن　　تا بماند نام نیکت برقرار

پہلا باب

تمام مسلمانوں کی روحانی مائیں

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

رسول اللہ ﷺ کی پہلی زوجہ مطہرہ ہیں آپ بیوہ تھیں اور چالیس سال کی عمر تھی تب حضور ﷺ نے پچیس سال کی عمر میں آپ سے پہلی شادی فرمائی لوگ سہاگن کو ابھاگن بناتے ہیں آپ نے ابھاگن کو سہاگن بنایا۔

ان کے والد کا نام خویلد بن اسد اور ان کی ماں کا نام فاطمہ بنت زائدہ ہے۔

حدیث میں ہے جب سے لوگوں نے میرے ساتھ کفر کیا اس وقت وہ مجھ پر ایمان لائیں اور جب سب لوگ مجھے جھٹلا رہے تھے اس وقت انہوں نے میری تصدیق کی اور جس وقت کوئی شخص مجھے کوئی چیز دینے کے لئے تیار نہ تھا اس وقت خدیجہ نے مجھے اپنا سارا مال سامان دے دیا اور انہیں کے شکم سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد عطا فرمائی۔

(زرقانی، جلد۳، ص۲۲۴۔ استعیاب، جلد۴، ص۱۸۱۷)

پینسٹھ برس کی عمر پا کر ماہ رمضان میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور مکہ مکرمہ کے مشہور قبرستان جنت المعلیٰ میں خود حضور اقدس ﷺ نے ان کی قبر انور میں اُتر کر اپنے مقدس ہاتھوں سے ان کو سپرد خاک فرمایا اس وقت نماز جنازہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

حضور اکرم ﷺ بقیہ تمام زندگی آپ کو یاد فرماتے رہے اور تمام ازواج مطہرات کے آگے ان کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

آپ حضور ﷺ کی دوسری بیوی تھیں۔ ان کے والد کا نام "زمعہ" اور ماں کا نام "شموس بنت عمرو" تھا۔ یہ بھی قریشی خاندان کی بہت ہی نامور اور معزز خاتون تھیں۔ یہ پہلے اپنے چچازاد بھائی "سکران بن عمرو" سے بیاہی گئی تھیں اور اسلام کی شروعات ہی میں یہ دونوں میاں بیوی مسلمان ہو گئے تھے اور کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر حبشہ کو ہجرت بھی کر چکے تھے لیکن جب حبشہ سے واپس ہو کر دونوں میاں بیوی مکہ مکرمہ میں آ کر رہنے لگے تو ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور حضور اکرم ﷺ بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد دن رات مغموم رہا کرتے تھے۔ چنانچہ خولہ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے باپ سے بات چیت کر کے نسبت طے کرا دی اور نکاح ہو گیا اور یہ عمر بھر حضور ﷺ کی زوجیت کے شرف سے سرفراز ہیں۔

ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں درہموں سے بھرا ہوا ایک تھیلا حضرت بی بی سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیج دیا انہوں نے اس تھیلی کو دیکھ کر کہا واہ بھلا کھجوروں کے تھیلے میں کہیں درہم بھیجے جاتے ہیں؟ یہ کہا اور اُٹھ کر اسی وقت ان تمام درہموں کو مدینہ منورہ کے فقراء و مساکین کو گھر میں بلا کر بانٹ دیا اور تھیلا خالی کر دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔ ماں کا نام ام رومان تھا۔ ان کا نکاح حضور اقدس ﷺ سے قبل ہجرت مکہ مکرمہ میں ہوا تھا لیکن کاشانہ نبوت میں یہ مدینہ منورہ کے اندر شوال ۲ ہجری میں آئیں۔ حضور اقدس ﷺ کا ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ کسی بیوی کے لحاف میں میرے اوپر وحی نہیں اتری مگر حضرت عائشہ جب میرے ساتھ نبوت کے بستر پر سوتی رہتی ہیں تو اس حالت میں مجھ پر وحی اترتی رہتی ہے۔ (بخاری، جلد۱، ص۵۳۲)

فقہ وحدیث کے علوم میں حضور کی بیبیوں کے درمیان ان کا درجہ بہت اونچا ہے بڑے بڑے صحابہ ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے عبادت میں بھی ان کا یہ عالم تھا کہ نماز تہجد کی بے حد پابند تھیں اور نفلی روزے بھی بہت زیادہ رکھتی تھیں۔ سخاوت اور صدقات وخیرات کے معاملہ میں حضور کی سب بیبیوں میں خاص طور پر بہت ممتاز تھیں۔ ام درہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ کہیں سے ایک لاکھ درہم ان کے پاس آئے آپ نے اسی وقت ان سب درہموں کو خیرات کر دیا۔ اس دن وہ روزہ دار تھیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے سب درہموں کو بانٹ دیا اور ایک

درہم بھی آپ نے باقی نہیں رکھا کہ اس سے آپ گوشت منگا لیتی۔ مؤرخہ 17 رمضان منگل کی رات میں ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں مدینہ منورہ کے اندر آپ کی وفات ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور رات میں دوسری ازواج مطہرات کے پہلو میں جنت البقیع کے اندر مدفون ہیں۔ (زرقانی، جلد ۳، ص ۲۳۴)

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تمام ازواج پاک میں گرم مزاج اور حق گو تھیں کیونکہ آپ دوسرے خلیفہ ارشد امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں پہلے حضرت حنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں اور میاں بیوی دونوں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے مگر ان کے شوہر جنگ احد میں زخمی ہو کر وفات پا گئے تو ۳ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمالیا۔

اکثر روزہ دار رہا کرتی تھیں، اور تلاوت قرآن مجید اور دوسری قسم قسم کی عبادتوں میں مصروف رہا کرتی تھیں، عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ و حدیث کے علوم میں بھی بہت معلومات رکھتی تھیں۔ شعبان ۴۵ ہجری میں مدینہ منورہ کے اندر ان کی وفات ہوئی۔ گورنر مدینہ مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے بھتیجوں نے قبر میں اتارا اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ بوقت وفات ان کی عمر ساٹھ یا تریسٹھ برس کی تھی۔ (زرقانی، جلد ۳، ص ۲۳۶)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

ان کا نام ''ہند'' اور کنیت ''ام سلمہ'' ہے لیکن یہ اپنی کنیت ہی کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں ان کے والد کا نام ''حذیفہ'' یا ''سہیل'' اور ان کی والدہ ''عاتکہ'' بنت عامر ہیں۔ یہ پہلے ابو سلمہ عبداللہ بن اسد سے بیاہی گئی تھیں اور یہ دونوں میاں بیوی مسلمان ہو کر پہلے ''حبشہ'' ہجرت کر گئے پھر حبشہ سے مکہ مکرمہ چلے آئے۔

پھر دونوں میاں بیوی مدینہ میں آ گئے چند بچے بھی ہو گئے تو حضرت ابو سلمہ فوت ہو گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بڑی بے کسی میں پڑ گئیں چند چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیوگی میں زندگی بسر کرنا دشوار ہو گیا۔ ان کا یہ حال زار دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمالیا اور بچوں کو اپنی پرورش میں لے لیا اس طرح یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گھر آ گئیں۔

مدینہ منورہ میں چوراسی برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ ان کا انتقال ۶۳ ہجری کے بعد ہوا ہے۔ ان کی قبر مبارک جنت البقیع میں ہے۔ (زرقانی، جلد ۳، ص ۲۳۸ تا ۲۴۲)

آپ نے امہات المومنین میں سب سے لمبی عمر پائی واقعہ کربلا کے بعد آپ کے پاس محفوظ مٹی خون آلود ہو گئی جو سرکار دو عالم ﷺ نے آپ کو دے کر فرمایا تھا کہ جب حسین کربلا میں شہید ہو گا یہ مٹی خون آلود ہو جائے گی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

یہ سردار مکہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں ان کی والدہ ''صفیہ بنت عاص'' ہیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ اور میاں بیوی دونوں اسلام قبول کر کے حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے مگر حبشہ جا کر عبیداللہ بن جحش نصرانی ہو گیا اور عیسائیوں کی صحبت میں شراب پیتے پیتے مر گیا لیکن ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے ایمان پر قائم رہیں اور بڑی بہادری کے ساتھ مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرتی رہیں۔ جب حضور اکرم ﷺ کو ان کے حال کی خبر ہوئی تو قلب نازک پر بے حد صدمہ گزرا اور آپ نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے حبشہ بھیجا اور نجاشی بادشاہ کے نام خط بھیجا کہ تم میرے وکیل بن کر حضرت ام حبیبہ کے ساتھ میرا نکاح کر دو۔ نجاشی بادشاہ نے اپنی لونڈی ''ابرہہ'' کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔ جب حضرت بی بی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے یہ خوشخبری کا پیغام سنا تو خوش ہو کر ابرہہ لونڈی کو انعام کے طور پر اپنا زیور اتار کر دے دیا پھر اپنے ماموں زاد بھائی حضرت خالد بن

سعید رضی اللہ عنہ کو اپنے نکاح کا وکیل بنا کر نجاشی بادشاہ کے پاس بھیج دیا اور انہوں نے بہت سے مہاجرین کو جمع کر کے حضرت ام حبیبہ کا نکاح حضور علیہ السلام کے ساتھ کر دیا اور اپنے پاس سے مہر بھی ادا کر دیا اور پھر پورے اعزاز کے ساتھ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بھیج دیا۔

ایک مرتبہ ان کے والد ابوسفیان جو ابھی کافر تھے مدینہ میں ان کے گھر آئے اور رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بیٹھ گئے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ذرا بھی باپ کی پرواہ نہ کی اور باپ کو بستر سے اٹھا دیا اور کہا کہ میں ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ ایک ناپاک مشرک رسول ﷺ کے اس پاک بستر پر بیٹھے۔

بہت سی حدیثیں بھی یاد تھیں اور انتہائی عبادت گزار اور حضور ﷺ کی بے انتہا خدمت گزار اور وفادار بیوی تھیں ۴۴ ہجری میں مدینہ منورہ میں ان کی وفات ہوئی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ دفن ہیں۔ (مدارج النبوۃ، جلد۲، ص۴۸۱)

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہ

یہ حضور علیہ السلام کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی ہیں حضور ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ سے ان کا نکاح کر دیا تھا لیکن زید رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی جب اُن کی عدت گزر گئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا۔ (الاحزاب:۳۷)

جب زید نے طلاق دیدی اور عدت گزر گئی تو ہم نے زینب کا تمہارے ساتھ نکاح کر دیا۔

اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کون ہے کہ جو زینب کے پاس جا کر اس کو یہ خوشخبری سنا دے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔ یہ سن کر ایک خادمہ دوڑی ہوئی گئی اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ خوشخبری سنا دی۔ حضرت زینب کو یہ خوشخبری سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ اپنے زیورات اتار کر خادمہ کو انعام میں دے دیے اور خود سجدہ میں گر پڑیں اور پھر دو ماہ لگاتار شکرانے کا روزہ رکھا۔ حضور علیہ السلام نے حضرت زینب کے ساتھ نکاح کرنے پر اپنی بڑی دعوت ولیمہ فرمائی کہ کسی بیوی کے نکاح پر اتنی بڑی دعوت ولیمہ نہیں کی تھی۔ (بخاری ومشکوۃ، جلد۲، ص۲۷۸)

حضور علیہ السلام کی مقدس بیبیوں میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اس خصوصیت میں سب بیبیوں سے ممتاز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح خود اپنے حبیب سے کر دیا۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے ہاتھ سے کچھ دستکاری کر کے اس کی آمدنی فقراء و مساکین کو دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضور نے فرمایا کہ میری وفات کے بعد سب سے پہلے میری اس بی بی کی وفات ہوگی جس کے ہاتھ سب بیبیوں سے لمبے ہیں۔ یہ سن کر سب بیبیوں نے ایک لکڑی سے اپنا اپنا ہاتھ ناپا تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ سب سے لمبا نکلا لیکن جب حضور ﷺ کی وفات اقدس کے سب سے پہلے حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تب لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہاتھ لمبا ہونے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مراد کثرت سے صدقہ دینا تھا۔ بہر حال اچھی قسم قسم کی صفات حمیدہ کی بدولت یہ تمام ازواج مطہرات میں خصوصی امتیاز کے ساتھ ممتاز تھیں ۲۰ ہجری یا ۲۱ ہجری میں مدینہ منورہ کے اندر ان کی وفات ہوئی اور امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر کوچہ و بازار میں اعلان کرا دیا تھا کہ سب لوگ ام المومنین کے جنازہ میں شریک ہوں چنانچہ بہت بڑا مجمع ہوا۔ امیر المومنین نے خود ہی ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور ان کو جنت البقیع میں دفن کیا۔ (مدارج النبوۃ، جلد۲، ص۴۷۶)

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا

یہ بچپن ہی سے بہت سخی تھیں غریبوں اور مسکینوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ اس لئے لوگ ان کو "ام المساکین" یعنی مسکینوں کی ماں کہا کرتے تھے پہلے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا تھا لیکن جب وہ جنگ احد میں شہید ہو گئے

تو حضور ﷺ نے ۳ ہجری میں ان سے نکاح کرلیا۔ مگر یہ حضور سے نکاح کے بعد صرف دو یا تین ماہ زندہ رہیں اور ربیع الاول ۴ ہجری میں بمقام مدینہ منورہ وفات پاگئیں اور جنت البقیع میں ازواج مطہرات کے پہلو میں مدفون ہیں۔ حضور ﷺ نے بعد میں آپ کی سوتیلی بہن حضرت ام المؤمنین بی بی میمونہ رضی اللہ عنہ سے نکاح فرمایا۔ (زرقانی، جلد ۳، ص ۲۲۹)

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا

حضرت میمونہ سے ۷۶ حدیثیں مروی ہیں جس سے آپ کی علم حدیث سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے والد کا نام حارث بن حزن اور ان کی والدہ ہند بنت عوف ہیں۔ پہلے ان کا نام "برہ" تھا مگر جب یہ حضور علیہ السلام کے نکاح میں آگئیں تو حضور نے ان کا نام میمونہ (برکت والی) رکھ دیا ۷ ہجری عمرۃ القضاء کی واپسی میں حضور نے ان سے نکاح فرمایا۔ ترمذی جلد اوّل صفحہ ۱۰۴ پر حضرت زید بن اصم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم نے حضرت امام میمونہ رضی اللہ عنہا کو اسی جگہ دفن کیا جہاں سرکار دو عالم ﷺ نے انہیں اپنی صحبت بابرکت سے مشرف فرمایا تھا۔ یعنی "سرف" میں۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات ۶۳ ھ میں سرف میں ہوئی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

یہ قبیلہ بنی مصطلق کے سردار اعظم حارث بن ضرار کی بیٹی ہیں۔ ان کا سارا قبیلہ گرفتار ہو کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدی بن چکا تھا۔ اور سب مسلمانوں کے لونڈی و غلام بن چکے تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت جویریہ کو آزاد کر کے ان سے نکاح فرمایا تو حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی شادمانی و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسلامی لشکر میں جب یہ خبر پھیلی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جویریہ سے نکاح فرمالیا تو تمام مجاہدین اسلام ایک زبان ہو کر کہنے لگے کہ جس

خاندان میں ہمارے رسول نے نکاح فرمایا اس خاندان کا کوئی فرد لونڈی غلام نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس خاندان کے جتنے لونڈی غلام مسلمانوں کے قبضہ میں تھے سب کے سب آزاد کر دیئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ دنیا میں کسی عورت کا نکاح حضرت جویریہ کے نکاح سے زیادہ مبارک ثابت نہیں ہوا، کیونکہ اس نکاح کی وجہ سے تمام خاندان بنی مصطلق کو غلامی سے نجات مل گئی۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کے میرے قبیلے میں آنے سے پہلے میں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ مدینہ کی جانب سے ایک چاند چلتا ہوا آیا اور میری گود میں گر پڑا۔ میں نے کسی سے اس خواب کا ذکر نہیں کیا لیکن جب حضور نے مجھ سے نکاح فرمایا تو میں نے سمجھ لیا کہ یہی میرے خواب کی تعبیر ہے۔ ان کا اصل نام "برہ" تھا مگر حضور نے ان کا نام "جویریہ" رکھ دیان۔ ان کے دو بھائی عمرو بن حارث و عبداللہ بن حارث اور ان کی ایک بہن عمرہ بنت حارث نے بھی اسلام قبول کر کے صحابیت کا شرف پایا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بڑی عبادت گزار اور دیندار تھیں۔ نماز فجر سے نماز چاشت تک ہمیشہ اپنے وظیفوں میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ ۵۰ ہجری میں پینسٹھ برس کی عمر پا کر وفات پائی حاکم مدینہ مروان نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور یہ جنت البقیع میں سپرد خاک کی گئیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا

خیبر کے سردار اعظم "حیی بن اخطب" کی بیٹی اور قبیلہ بنی نضیر کے رئیس اعظم "کنانہ بن الحقیق" کی بیوی تھیں جو "جنگ خیبر" میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یہ خیبر کے قیدیوں میں گرفتار ہو کر آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی خاندانی عزت و وجاہت کا خیال فرما کر اپنی ازواج مطہرات اور امت کی ماؤں میں شامل فرمالیا۔ جنگ خیبر سے واپسی پر تین دنوں تک منزل صہبا میں آپ نے ان کو اپنے خیمہ کے اندر اپنی قربت سے سرفراز فرمایا اور ان کے ولیمہ میں کھجور، گھی اور پنیر کا مالیدہ آپ نے صحابہ کرام کو کھلایا۔ یہ بہت ہی عبادت گزار اور دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ سیکھنے کا بھی جذبہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ دس حدیثیں بھی ان سے مروی ہیں۔ ان کی وفات کے سال میں اختلاف ہے واقدی نے ۵۰ ہجری اور ابن سعد نے ۵۲ ہجری لکھا ہے۔ یہ بھی مدینہ طیبہ کے مشہور و معروف قبرستان جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ (مدارج النبوۃ، جلد ۲،

عظیم نبی ﷺ کی عظیم بیٹیاں

یایھا النبی قل لازواجك وبنٰتك ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ؕ ذٰلك ادنٰی ان یعرفن فلا یؤذین ؕ وکان اللہ غفورا رحیما ۝

اے نبی (ﷺ) اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرما دو کہ اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں یہ اس سے نزدیک تر ہے کہ ان کی پہچان ہو تو ستائی نہ جائیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (پ۲۲، الاحزاب، ع۴)

آیت کے شروع میں ہی تینوں جملے جمع کے استعمال ہوئے ہیں۔ ازواج، بنات، نساء المومنین تو ثابت یہ ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کی ایک بیٹی نہیں آپ کی کل چار بیٹیاں ہیں۔

دوسری آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

ادعوھم لاٰبائھم ھو اقسط عند اللہ۔ (پ۲۲، الاحزاب)

انہیں ان کے باپ کا ہی کہہ کر پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ ٹھیک ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے نزدیک یہی بات مقبول ہے کہ اولاد کو ان کے اصل باپوں کے نام سے پکارا جائے۔ اگر یہ شائبہ گزرے کہ معاذ اللہ رسول کی دیگر بیٹیاں سوتیلی تھیں یہ ان کو خطاب ہے تو یہ بھی صریحاً غلط اور الزام ہے۔ قرآن نے اس کی وضاحت فرما دی ہے۔

وربائبکم التی فی حجورکم من نسائکم التی دخلتم بھن۔

ترجمہ: اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ سگی بیٹی کے لئے ربائب کا لفظ استعمال نہیں ہوتا لہٰذا حضور اکرم ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔

عام طور پر مسلمانوں میں حضور ﷺ کی چھوٹی شہزادی حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا

ہی مشہور و معروف ہیں اور ان کی عظیم بڑی بہنوں کو عام مسلمان نہیں جانتے اس لئے اس تحریر میں حضرت سیدۂ کائنات کی بڑی بہنوں کا ذکر کر کے اللہ اور رسول کی رضا و خوشنودی کے ساتھ ساتھ حضرت خاتون جنت کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا

حضور اکرم ﷺ کی شہزادیوں میں بڑی دختر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا کہ سیدہ زینب بنت رسول کی ولادت واقعہ فیل کے تیس برس بعد ہوئی۔ اسلام میں داخل ہوئیں اور ہجرت کی۔ ان کا نکاح ان کی خالہ کے فرزند کے ساتھ کیا گیا تھا جن کا نام ابو العاص اور حضرت ابو العاص کی ماں ہند بنت خویلد سیدہ خدیجہ بنت خویلد کی بہن تھیں اور ابو العاص اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔ لقیط نام ہے۔ حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے سیدہ زینب نے ہجرت کی اور ان کو اسی حالت پر چھوڑ دیا۔

حضرت ابو العاص بدر کے قیدیوں میں داخل تھے جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی آزادی کا فدیہ بھیجا تو سیدہ زینب بنت رسول اللہ نے ابو العاص کے فدیہ میں وہ ہار بھیجا جو ان کے گلے میں رہتا تھا جسے حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے بوقت عقد سیدہ زینب کو دیا تھا جب حضور اقدس ﷺ نے اس ہار کو ملاحظہ فرمایا تو سیدہ خدیجہ کی محبت کا زمانہ یاد آ گیا اور سخت رقت طاری ہوئی۔ اصحاب سے فرمایا اگر تم مناسب جانو تو ابو العاص کو رہا کر دو اور فدیہ کا ہار زینب کو لوٹا دو۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ہم اسی طرح کریں گے جس طرح آپ کی مرضی ہو گی۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو العاص سے عہد لیا کہ وہ سیدہ زینب کو آپ کی طرف بھیج دیں گے ابو العاص نے اسے مان لیا اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے زید بن حارثہ اور ایک انصاری کو مکہ مکرمہ بھیجا کہ سیدہ زینب کو لے آئیں اور فرمایا کہ مکہ مکرمہ کے اندر نہ جانا بلکہ وادی ناجج میں ٹھہرنا۔

جب وہ سیدہ زینب کو تمہارے حوالے کر دیں تو ان کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ

آ جانا اس واقعہ کے اڑھائی سال بعد حضرت ابو العاص ایک تجارت کی غرض سے مکہ مکرمہ سے باہر آئے ان کے ساتھ مکہ والوں کا مال تجارت تھا اس تجارتی قافلہ کی واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ان کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے قافلہ پر قابو پا لیا تو چاہا کہ حضرت ابوالعاص کے مال پر قبضہ کر لیا جائے اور ان کو قتل کر دیا جائے۔ یہ خبر جب سیدہ زینب رضی اللہ عنہا تک پہنچی تو آپ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا کسی مسلمان کو کسی کو امان میں لینے کا حق نہیں ہے آپ نے فرمایا ہاں ہے۔ سیدہ زینب نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ گواہ رہیئے کہ میں نے ابوالعاص کو امان دے دی۔ جب صحابہ کرام کو خبر ہوئی تو انہوں نے حضرت ابوالعاص کے مال سے ہاتھ کھینچ لیا اور ابوالعاص سے کہا مسلمان ہو جاؤ تاکہ مشرکین کا تمام مال تمہارے لئے غنیمت ہو جائے۔

ابوالعاص نے کہا میں شرم کرتا ہوں کہ اپنے دین کو اس ناپاک مال کے لئے پلید کروں اس کے بعد وہ مکہ چلے گئے اور اس مال کو مالکوں کے سپرد کر دیا اور فرمایا اے مکہ والو! آیا میں نے تمہارا مال پہنچا دیا تم مجھے اس سے بری الذمہ قرار دیتے ہو۔ انہوں نے کہا ہاں پھر ابوالعاص نے کہا تم گواہ ہو میں گواہی دیتا ہوں کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے اور حضور سید عالم ﷺ نے نکاح سابق یا جدید نکاح کے ساتھ حضرت زینب کو ان کے سپرد کیا۔

حضرت سیدہ زینب بنت رسول کا وصال ۸ ہجری میں ہوا۔ جب حضور ﷺ کو اپنی بیٹی کی خبر ہوئی تو آپ کو شدید صدمہ پہنچا اور حکم دیا کہ میری بیٹی کو بیری کے پتے ملا کر خالص پانی کے ساتھ غسل دیا جائے حضرت سودہ بن زمعہ، حضرت ام ایمن، حضرت ام عطیہ انصاریہ نے امام الانبیاء کی شہزادی کو غسل دیا۔ صحیحین میں ہے کہ ان کے غسل میں شیر دل صحابیہ ام سلیط رضی اللہ عنہا نے شرکت کی اور انہوں نے اس کو بیان کیا۔ ام عطیہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ اس حال میں تشریف لائے کہ ہم سیدہ زینب کو غسل دے رہے تھے اور فرمایا میری بیٹی کو غسل دو اور آخری مرتبہ کافور ملو اور غسل تین مرتبہ دو اس کے بعد فرمایا مجھے فراغت غسل

کی اطلاع دینا۔ ام عطیہ جو حدیث کی راوی ہیں فرماتی ہیں کہ جب ہم سیدہ زینب کو غسل دے دینے کی خبر دے چکے اور حضور اقدس ﷺ نے اپنا تہبند مبارک بھیجا اور فرمایا میری بیٹی کو اس میں کفن دو۔

ام عطیہ فرماتی ہیں کہ ہم نے اس چادر تہبند شریف میں آپ کو کفنایا اور سر کے مبارک بالوں کی تین لٹیں بنائیں اور ان کو سر کی پچھلی جانب کیا اس کے بعد جنازہ پڑھا گیا اور حضور اقدس ﷺ نے ان کو بقیع میں پہنچانے کا حکم دیا۔ جب قبر میں اتارا جانے لگا تو حضور اقدس ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔

حضرت سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دوسری بیٹی حضرت سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی ولادت واقعہ فیل کے ۳۳ برس بعد ہے اور سیدہ زینب کی ولادت کے تین سال بعد سیدہ رقیہ کی ولادت ہوئی۔ سیدہ رقیہ عہد نبوت سے قبل عتبہ بن ابی طالب کی زوجیت میں تھیں ان کی بہن سیدہ ام کلثوم اس عتبہ کے بھائی عتیبہ کی زوجیت میں تھیں۔

عتیبہ کا مسلمان ہو کر مقبول الاسلام بن کر صحابہ کی گنتی میں شمار ہوا ہے اور وہ جو حضور اقدس ﷺ کی دعا کا قصہ ہے جس کے بارے میں حضور علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوئی اور اسے زیر نے پھاڑ ڈالا۔

جب سورۃ تبت یدا ابی لھب و تب نازل ہوئی تو ابولہب نے عتبہ سے کہا او عتبہ تیرا سر حرام ہے مطلب یہ کہ میں تجھ سے بیزار ہوں اگر تو محمد ﷺ کی بیٹی کو اپنے سے جدا نہ کرے اس پر اس نے جدائی کر لی اور علیحدہ ہو گیا۔ اہل تفسیر کہتے ہیں کہ قریش نے ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیٹی سیدہ زینب کو جدا کرنے پر ابھارا لیکن انہوں نے فرمایا خدا کی قسم میں ہرگز سید عالم علیہ السلام کی بیٹی کو جدا نہیں کروں گا اور نہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اس کے عوض قریش کی کوئی اور عورت ہو۔

بہر حال اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ رقیہ کا نکاح حضرت عثمان ابن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصیٰ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں کر دیا اور اس وقت مکہ مکرمہ میں یہ بات مشہور ہوگئی۔

اَحْسَنُ زَاهُمَا اِنْسَانٌ رُقَيّه وَزَوْجهَا عُثْمَانُ۔

جو سب سے اچھا جوڑا دیکھا گیا وہ سیدہ رقیہ اور سیدنا عثمان کا ہے۔

حضرت عثمان نے ان کے ساتھ دو ہجرتیں فرمائیں ایک حبشہ کی طرف اور دوسری حبشہ سے مدینہ کی طرف۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کی شان میں فرمایا حضرت سیدنا لوط علیہ السلام کے بعد یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خدا کی طرف ہجرت کی۔

حضرت سیدہ رقیہ کو چیچک کا عارضہ ہوا اور حضور اقدس علیہ السلام جب غزوہ بدر کو تشریف لے جا رہے تھے تو سیدہ صاحب فراش تھیں آپ نے ان کی تیمار داری کے لئے سیدنا عثمان اور اسامہ بن زید کو مدینہ میں چھوڑا۔

چنانچہ سیدہ رقیہ کا اسی مرض میں ارتحال ہوا اور منقول ہے کہ سیدہ کے انتقال پر عورتیں روتی تھیں مگر حضور اقدس ﷺ نے کسی کو منع نہ فرمایا۔ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سیدہ رقیہ کی قبر کے سرہانے سید عالم علیہ السلام کے پہلو میں بیٹھی رو رہی تھیں اور حضور اقدس ﷺ اپنی چادر مبارک کے کنارہ سے سیدنا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی چشم مبارک سے آنسو پونچھتے تھے اس کے باوجود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سیدہ رقیہ کی تعزیت کی گئی تو فرمایا الحمد للہ دفن البنات من المکروھات۔

حضور علیہ السلام ان کے انتقال کے دنوں نزدیکی زمانہ میں تشریف لائے۔ سیدہ رقیہ کی عمر مبارک بوقت انتقال اکیس برس تھی سیدہ کے بطن سے ایک فرزند حضرت عبداللہ حضرت عثمان کے ہاں پیدا ہوئے۔

حضرت سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا

رسول خدا ﷺ کی تیسری بیٹی حضرت سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں جو عتبہ ابن وہب کی زوجیت میں تھیں۔ منقول ہے کہ عتبہ نے جب ام کلثوم سے جدائی کی اور وہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں آیا اور کہنے لگا میں آپ کے دین سے کافر ہوا مجھے نہ آپ کا دین پسند ہے اور نہ ہی آپ مجھے پیارے ہیں۔ اس بدبخت نے زیادتی یہ کی کہ آپ کی قمیص مبارک پھاڑ دی اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا ھو یکفر بالذی دلی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی ظاہر ہے کہ اس نے یہ الفاظ سورۃ نجم سے لئے چونکہ مکہ مکرمہ میں ان دنوں نازل ہو چکی تھی اہل سیر کہتے ہیں کہ اس ملعون نے اتنی گستاخی کی کہ اس نے ناپاک منہ کا تھوک آپ کی جانب پھینکا اور کہا کہ میں ام کلثوم کو طلاق دے دی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا

اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِّنْ كَلَابِكَ۔

اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا مسلط کر دے۔

حضرت ابوطالب اس وقت مجلس میں حاضر تھے انہوں نے کہا میں نہیں جانتا کہ تجھے کون سی چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کے تیر سے بچا سکے گی۔

چنانچہ یہ ملعون تجارت کی غرض سے شام کی طرف جا رہا تھا راستے میں جب اس نے ایک ایسی جگہ پر پڑاؤ ڈالا جہاں درندے تھے تو ابولہب نے قافلہ والوں سے کہا کہ آج کی رات تم سب ہماری مدد کرو کیونکہ میں ڈرتا ہوں محمد ﷺ کی دعا میرے بیٹے کے حق میں آج کی رات اثر کرے اس پر سب نے اپنے سامان کو اکٹھا کیا اور نیچے اوپر چنا اور سامان کے اوپر عتبہ کے سونے کی جگہ بنائی اور اس کے چاروں طرف گھیرے ڈال کر بیٹھ گئے اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دیا ایک شیر آیا اور اس نے ایک ایک کر کے منہ کو سونگھا اور کسی سے اس نے تعرض نہ کیا پھر اس نے جست لگائی اور عتبہ پر پنجہ مارا اور اس کے سینے کو پھاڑ ڈالا ایک روایت میں ہے کہ اس نے عتبہ کی گردن کو دبوچا۔

حضور علیہ السلام نے سیدہ رقیہ کے انتقال کے بعد سیدہ ام کلثوم کا ہجرت کے تیسرے سال حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے نکاح فرمادیا اور فرمایا یہ جبرائیل علیہ السلام کھڑے مجھے خبر دے رہے ہیں کہ حق تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ میں ان کو تمہارے نکاح میں دے دوں جب سیدہ کا نکاح ۳ ہجری میں حضرت عثمان سے ہوگیا تو ان کو ذوالنورین کا خطاب ملا ابن عساکر نے حضرت علی المرتضیٰ سے نقل کیا ہے کہ آپ سے حضرت عثمان کے بارے میں پوچھا گیا تو سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا!

وہ تو ہیں جن کو ملا اعلیٰ کے فرشتے ذوالنورین سے یاد کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی دو بیٹیاں تھیں۔

جن دنوں سیدہ رقیہ کا انتقال ہوا ان دنوں میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دختر حضرت حفصہ بیوہ ہوگئیں تھیں سیدنا عمر فاروق نے حضرت عثمان سے اپنی بیٹی کا ذکر کیا انہوں نے انکار کیا سیدنا عمر فاروق کو اس پر رنج ہوا اور بارگاہ اقدس رسالت مآب ﷺ میں شکایت کی۔
آپ نے فرمایا عمر کچھ خیال نہ کرو۔

اَلاوّلُ عُثْمَانَ عَلٰی مَنْ ھُوَ خَیْرٌ لَّهُ مِنْهُمَا وَاَوّلَهَا عَلٰی مَنْ ھُوَ خَیْرٌ لَّهَا عُثْمَان۔

عثمان کو حفصہ سے بہتر زوجہ ملے گی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر ملے گا۔

اس ارشاد کے بعد حضرت سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا بنت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہا کو ام المومنین کا شرف حاصل ہوا اور امام الانبیاء ان کے شوہر ہوئے اور سیدنا عثمان کو بہترین زوجہ سیدہ ام کلثوم بنت رسول حاصل ہوئیں۔

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے ہجرت کے نویں سال انتقال فرمایا۔ حضور علیہ السلام نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی قبر پر بیٹھے رہے اور آنسو رواں تھے۔
حضرت علی المرتضیٰ وفضل عباس واسامہ بن زید نے مراسم تدفین پورے فرمائے۔

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضور علیہ السلام نے حضرت عثمان سے فرمایا اگر میرے پاس اور بیٹیاں بھی ہوتیں تو تمہارے نکاح میں یکے بعد دیگرے دیتا جاتا اور وہ وفات پاتی رہتیں۔

نوٹ! تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی تمام مقدس بیٹیوں کے نام اور ان کے حالات زندگی کو یاد کریں اور ان کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے محبوب ﷺ کی رضا وخوشنودی حاصل کریں۔

حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

پہلے سلطانِ اسلام

حضور اکرم ﷺ کے مبارک ہونٹوں سے ہدایت و حکمت کے جو پھول جھڑے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”میرے تمام صحابہ ستارگان ہدایت ہیں تم جس کی بھی پیروی کرو گے منزل ہدایت پر پہنچ جاؤ گے“۔

تمام صحابہ کرام اپنے اپنے شعبوں کے حوالے سے اُمت کے لئے روشنی کے مینار ثابت ہوئے ہیں۔ فقر و درویشی کی راہ پر چلنے والوں کے لئے حضرت علی، حضرت ابوذر غفاری، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ایسے ہی دیگر تابندہ کردار موجود تھے۔

تاجروں کی راہنمائی کے لئے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم اور ایسے ہی دیگر بزرگ صحابہ کا کردار مشعل راہ تھا۔

جرنیلوں کے لئے حضرت فاروق اعظم اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کی معرکہ آرائیاں تاریخ کی کتابوں کے زندہ باب ہیں۔

اسی طرح بادشاہوں اور حاکموں کے لئے عملی نمونہ بھی ضروری تھا خلفائے راشدین کے بعد اگر سلاطین اسلام کے لئے کوئی صحابی رسول آئیڈیل ہوسکتا ہو تو وہ حضرت سیدنا امیر معاویہ ؓ کی جاہ و حشمت والی شخصیت ہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروق ؓ نے فرمایا ”معاویہ اسلام کے کسریٰ ہیں“۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے انگریزوں کی سرکوبی کے لئے جو چار لشکر مرتب فرمائے ان میں ایک لشکر کے قائد حضرت امیر معاویہ ؓ کے بھائی حضرت یزید بن سفیان ؓ کو مقرر کیا۔ حضرت سیدنا امیر معاویہ ؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے اور ہراول دستے کے کمانڈر تھے۔ اس مہم میں حضرت یزید بن ابوسفیان اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم دونوں بھائیوں نے

نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

دمشق اور اس کے مضافات کی فتح میں گو زیادہ حصہ حضرت سیدنا یزید بن ابوسفیان ؓ کا تھا مگر ان معرکوں میں حضرت سیدنا امیر معاویہ ؓ کی جنگی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب دمشق فتح ہوگیا اور اسلامی فوجوں نے اردگرد کے مقامات پر بھی اسلامی پرچم لہرا دیا تو حضرت عمر ؓ نے یزید بن ابوسفیان کو ان علاقون (دمشق اور مضافات) کا گورنر مقرر کیا۔

۱۸ھ میں حضرت یزید بن ابوسفیان ؓ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت امیر معاویہ ؓ کو دمشق اور اس کے مضافات کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان غنی ؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے حضرت سیدنا امیر معاویہ ؓ کو پورے صوبہ شام کا گورنر بنا دیا۔

دمشق کی فتح کے بعد جب حضرت یزید بن ابوسفیان ؓ نے عرقہ، جبیل، بیروت اور صیدا کی طرف پیش قدمی کی تو ان مہمات میں ہراول دستوں کی قیادت حضرت امیر معاویہ ؓ ہی نے کی اور خاص طور پر عرقہ کی فتح کا سہرا تو انہی کے سر ہے۔

حضرت عمر فاروق ؓ کی خلافت کے آخری دور میں شام کے بعض علاقوں میں جب زبردست بغاوت رونما ہوئی اور متعدد شہر اسلامی سلطنت سے نکل گئے تو حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت امیر معاویہ ؓ ہی کو ان علاقوں کی بازیابی پر مقرر فرمایا اور امیر معاویہ ؓ کے اعتماد پر پورے اُترے۔

آپ قیساریہ پہنچے انگریز سپہ سالار نے ان کا زبردست مقابلہ کیا مگر آخرکار شکست کھا کر قلعہ بند ہوگیا۔ حضرت معاویہ ؓ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران میں انگریزوں نے شہر سے نکل نکل کر امیر معاویہ ؓ کے لشکر پر متعدد حملے کیے مگر انہیں ہر حملے میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر ایک شدید جنگ کے بعد انگریزوں نے ہتھیار

ڈال دیئے اور قیساریہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبضہ کرلیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انہوں نے طرابلس، الشام، ملطیہ، عموریہ، شمشاط اور قبرص تک اسلامی سلطنت کو وسیع کردیا۔

حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کے باعث ۴۱ھ میں جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ساری اسلامی دنیا کے پہلے سلطان ہوگئے تو انہوں نے اسلامی سلطنت کی توسیع کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے حکمران ہونے کے بعد بلخ، ہرات اور باذغیس وغیرہ میں زبردست بغاوت رونما ہوئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے قیس بن ہیثم کو ان بغاوتوں کے ختم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور قیس نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ایک ایک بغاوت کو ختم کر کے سارے شہروں کو فتح کرلیا۔

اسی طرح کابل اور غور کے علاقوں کے لوگوں نے بھی ۴۳ھ میں علم بغاوت بلند کردیا تھا مگر امیر معاویہ کے جرنیلوں عبدالرحمٰن بن سمرہ اور حکم بن عمرو غفاری نے ان بغاوتوں کو بھی ٹھنڈا کردیا اور ان علاقوں میں مکمل امن و امان قائم ہوگیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوج کی تنظیم کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی۔ تمام بارڈرز پر چھاؤنیاں قائم کیں اور تمام بڑے بڑے شہروں میں مستحکم قلعے بنوائے۔ شام، مدینہ، مرقیہ، طرطوس اور روڈس کے مضبوط قلعے جو امیر معاویہ نے حفاظتی مقاصد کے لئے تعمیر کرائے تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے قلعے جو ان کے پیش رو خلفاء نے بنوائے تھے اور کسی وجہ سے ویران یا مسمار ہوگئے تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی مرمت کرا کر دوبارہ قابل استعمال بنایا۔

بعض نئے شہر بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آباد کرائے اور بعض مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں آباد کرایا تاکہ وہاں کی مقامی آبادی شرانگیزی نہ کرسکے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے آباد کردہ شہروں میں مرعش اور قیروان کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ بات تاریخی طور پر مشہور اور مستند ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے سلطانِ اسلام ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا بحری بیڑہ قائم کیا۔ اس بحری بیڑے کو ترقی دینے کے لئے انہوں نے جہاز سازی کے متعدد کارخانے قائم کیے۔ انہوں نے بحری بیڑے کو بری فوج سے علیحدہ کر کے ایک مستقل فوج کی حیثیت دی۔ اور اس کا ایک الگ کمانڈر انچیف مقرر کیا۔ جسے ''امیر البحر'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ''ایڈمرل'' امیر البحر ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ تاریخ اسلام کے سب سے پہلے امیر البحر حضرت عبداللہ بن قیس حارثی تھے۔

حضرت امیر معاویہ نے اپنے عہد حکومت میں جو اصلاحات کیں ان میں ڈاک کے انتظام کی بہترین خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ڈاک کی چوکیاں قائم کیں۔ جن کا جال ساری سلطنت میں پھیلا ہوا تھا۔ ان چوکیوں میں برق رفتار گھوڑے ہر وقت موجود رہتے تھے جن کے ذریعے ڈاک ایک شہر سے دوسرے شہر تک نہایت آسانی اور بہت تیزی سے پہنچتی تھی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا بڑا خیال رہتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ اس کا سب سے زیادہ انحصار زراعت پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے زراعت کی ترقی کے لئے متعدد نہریں کھدوائیں اور برساتی نالوں کے پانی کو محفوظ کرنے کے لئے ڈیم بنوائے۔ یہ ڈیم اور نہریں شام حجاز خراسان اور ترکستان میں بکثرت تعمیر کروائے گئے۔ بعض جگہ پہاڑوں تک کو کاٹ کر نہریں نکالیں گئیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ جب تک ملک کے اندر امن و امان نہیں ہوگا اس وقت تک ملک کو استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے محکمہ پولیس کی تنظیم نو کی طرف خاص توجہ دی اور اس کی تعداد میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس افسروں کے اختیارات بھی

وسیع کئے تا کہ فسادی اور بدمعاش عناصر کی نگرانی کا خاص اہتمام کیا اور اپنے عمال کو حکم دیا کہ ہر شہر میں اوباش اور مفسد لوگوں کو تلاش کر کے ان کا ریکارڈ رکھا جائے اور ان کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھی جائے۔ پولیس کی ایک جماعت کی ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ وہ گلیوں اور بازاروں میں گشت کر کے بدمعاشوں کی نگرانی کیا کرتی تھی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد حکومت اور ان کی انتظامی قابلیت کو دیکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان جیسی شخصیت عالم اسلام میں ان کے بعد نہیں آئی۔ ان میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی غیر معمولی صلاحیت تھی اور مردم شناسی میں تو وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ الغرض ایک اچھے بادشاہ میں جو خوبیاں ہوسکتی ہیں وہ تمام حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دور میں مملکت داخلی استحکام کی حامل رہی اور تمام طبقات آپ سے خوش رہے آپ نے حضرت سیدنا امام حسن اور حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہم اور اہل بیت پاک کے دیگر شہزادوں کے بڑے بھاری وظیفے مقرر کر رکھے تھے اور ان کی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے اس کی برکت سے آپ کی حکومت غیر معمولی کامیابی سے ہمکنار رہی اور آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی تائید وحمایت کے ساتھ ساتھ اہل بیت پاک کا ہر ممکن تعاون بھی حاصل رہا اور وہ آپ سے ہمیشہ خوش رہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نجی زندگی ایک سچے اور پکے عاشق رسول کی زندگی تھی۔ آپ نے مختلف ذرائع سے حضور اکرم ﷺ کے تبرکات جمع کر کے انتہائی رازداری اور کمال عقیدت واخلاص کے ساتھ تمام عمر اپنے پاس رکھے اور ہمیشہ ان کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہے جب آپ کا وقت آخر آیا تو فرمایا ''کاش میں ایک دیہاتی اور گمنام آدمی ہوتا اور خاموشی سے زندگی گزار کر مر جاتا''۔ آپ کے اس قول سے آپ کے ترک دنیا اور مال ودولت سے بے رغبتی کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۴۰ سال شاندار حکومت کرنے کے باوجود بھی حب دنیا کو

دل میں جگہ نہ دی۔ آنے والے سلاطین اور مسلم حکمرانوں کے لئے آپ کا کردار ہر طرح آئیڈیل کردار تھا۔

وقت آخر آپ نے فرمایا ''مجھے قبر میں رکھنے کے بعد سرکار ختمی مرتبت ﷺ کے تراشیدہ ناخنوں کے تبرکات میری دونوں آنکھوں پر رکھ دینا اور مجھے میرے اللہ کے حوالے کر دینا''۔

جالوں پہ جال پڑ گئے للہ وقت ہے
مشکل کشائی آپ کے ناخن اگر کریں

(امام احمد رضا)

حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ

پورا مدینہ منورہ خواب راحت کے مزے لوٹ رہا تھا اور 22 لاکھ مربع میل کا حکمران ایک اجنبی کا بھیس بدل کر دارالخلافہ کے سنسان گلی کوچوں میں گشت کر رہا تھا۔ رات دھیرے دھیرے سمٹ رہی تھی اور صبح صادق کا نور ہویدا ہوا چاہتا تھا۔ امیر المومنین بھی گھر کی راہ لینے والے تھے کہ کسی مکان سے ابھرنے والی پُراسرار آوازوں پر سراپا تجسس بن کر ٹھہر گئے۔ ایک عورت اپنی بیٹی سے تحکمانہ لہجے میں کہہ رہی تھی "دودھ میں پانی ملاؤ" اور بیٹی کہہ رہی تھی ماں آپ کو معلوم نہیں؟ امیر المومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کر رکھا ہے۔ ماں نے اصرار کرتے ہوئے کہا، تو دودھ میں پانی ملا امیر المومنین کونسے یہاں بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ لڑکی نے بھی ایمانی حرارت سے بھرپور جواب دیا ماں امیر المومنین اگر نہ بھی دیکھ رہے ہوں تو خدا تو دیکھ رہا ہے۔

لڑکی کا ایمانی جذبہ دیکھ کر امیر المومنین حضرت فاروق اعظم وجدانی کیفیت سے سرشار ہو گئے اور غلام سے کہا اس گھر کو نظر میں رکھو اور صبح جب دربار خلافت سجے تو اس گھر کے مکینوں کو دربار میں پیش کرو۔

صبح دربار لگا تو غلام نے ماں بیٹی کو دربار میں پیش کیا امیر المومنین نے ماں کو تادیب وتنبیہ کی اور لڑکی کو انعام واکرام سے نوازا۔

دربار خلافت برخاست ہوا تو حضرت فاروق اعظم کسی گہری سوچ میں ڈوبے گھر پہنچے اپنے بیٹوں کو بلایا اور اس نیک سیرت لڑکی کا تذکرہ کر کے اپنے بیٹوں سے فرمایا میں اس لڑکی کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں بتاؤ تم میں سے کون اُسے قبول کرنے کو تیار ہے تمام بیٹے اس غیر متوقع اور اچانک سوال پر تقریباً شپٹا کر رہ گئے اور دبے لفظوں میں کہنے لگے کہ آپ بنو اُمیہ کی ایک "معمولی گوالن" کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ حضرت

فاروق اعظم بولے اسلام میں ذات پات کا کوئی تصور نہیں اور کفو کا مسئلہ بھی لڑکی کے وارثوں کی طرف سے ہوتا ہے لڑکے کی طرف سے نہیں لڑکا اگر چاہے تو غیر کفو سے شادی کر سکتا ہے۔ اسلام تو صرف سیرت و کردار کی اہمیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ تم میں جو میری خوشنودی حاصل کرنا چاہے میری اس خواہش کو فیصلہ سمجھ کر قبول کر لے۔ حضرت عاصم بن عمر تابعی رضی اللہ عنہ نے شادی پر رضامندی ظاہر کر دی اور بنو اُمیہ کی یہ معمولی گوالن کاشانہ فاروقی کی عزت بن گئی۔

مروان اور اس کے خاندان نے بالعموم اپنی بربریت و جانوریت کے باعث ہمیشہ مسلمانوں کی نفرتیں ہی سمیٹی ہیں لیکن مروان کے بیٹے عبدالعزیز کی فیروزمندی کہیئے کہ اُن کے گھر میں حضرت فاروق اعظم کی پوتی کا ایسا مبارک قدم پڑا کہ شقاوتوں کو سعادتوں میں بدل ڈالا۔

علامہ غلام مصطفٰی مجددی "مجددینِ اسلام" میں لکھتے ہیں "یقیناً یہ حضرت اُم عاصم کے حسن تربیت اور پاکیزہ دودھ کا فیضان تھا کہ عمر بن عبدالعزیز مروان کے خارستان میں خوشرنگ پھول کی طرح جلوہ نما ہوئے"۔

65ھ میں اس "مدنی منے" کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ صحابی رسول حضرت انس بن مالک آپ کے استاد مقرر ہوئے ویسے آپ کے نانا حضرت عاصم بن عمر کے بڑے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر آپ کے "علمی آئیڈیل" تھے۔ سن بلوغت تک آپ قرآن کے حافظ اور علوم قرآن کے ماہر ہو چکے تھے حدیث نبوی کے درس و مطالعہ کا سلسلہ آپ نے عمر بھر جاری رکھا کیونکہ وہ دور تدوین حدیث کا ابتدائی دور تھا۔

آپ کے والد عبدالعزیز مصر کے گورنر تھے لہٰذا آپ تعلیمی سرگرمیوں سے فارغ ہو کر "مطالعاتی دورے" پر مصر چلے گئے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا، حکومت وسیاست کے اسرار ورموز سے آگاہی حاصل کی پھر مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

عبدالعزیز کے انتقال کے بعد آپ کے تایا عبدالملک بن مروان نے آپ کو

دارالخلافہ دمشق بلوالیا اور اپنی بیٹی فاطمہ سے آپ کی شادی کر دی۔ 86ھ میں آپ کے سسر عبدالملک بن مروان کی موت کے بعد آپ کا بڑا سالہ ولید برسر اقتدار آیا یہ وہی بدنام زمانہ ولید ہے جس نے فاتح یورپ وافریقہ طارق بن زیاد اور فاتح سندھ و پنجاب محمد بن قاسم جیسے عظیم مسلم ہیروز کو قید کیا تھا اور عراق میں حجاج بن یوسف جیسے ظالم کو کھلا چھوڑا ہوا تھا۔

ولید نے 26 سالہ عمر بن عبدالعزیز کو جب سن 87 میں مدینہ منورہ کا گورنر بنایا تو آپ نے اس شرط پر یہ عہدہ قبول کیا کہ ''مجھے ظلم وستم کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سات سال اس عہدہ پر کام کیا سات سال میں آپ نے مدینہ منورہ کو ترقی وخوشحالی کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا جب حجاج بن یوسف کو پتا چلا کہ مدینہ شریف میں اتنی خوشحالی اور سیاسی آزادی ہے کہ لوگ عراق سے ہجرت کر کے مدینہ شریف جا رہے ہیں تو ظالم حجاج نے آپ کے خلاف محلاتی سازشوں کا مکروہ سلسلہ شروع کر دیا اور بالآخر ولید پر سیاسی اور خاندانی دباؤ ڈال کر سن 93 میں آپ کو مدینہ اور اہل مدینہ کی اس عظیم خدمت سے محروم کروا دیا۔

تین سال بعد 96 میں جب ولید اپنے انجام کو پہنچا تو اُس کا چھوٹا بھائی سلیمان تخت پر بیٹھ گیا۔ یہ سلیمان بھی خود تو ظالم اور فاسق وفاجر تھا لیکن مسلم قوم پر اس کا یہ احسان ہے کہ مرتے وقت وہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کی بجائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ نامزد کر گیا۔ سچ ہے قدرت جب چاہے فاسق وفاجر سے بھی اچھا کام لے لیتی ہے۔ پہلی صدی ہجری کا سب سے بڑا فتنہ حکومتی فتنہ تھا۔ ظالم، جاہل جابر اور مطلق العنان حکمران اسلام کے مقدس چہرہ کو بگاڑنے کے درپے تھے ایسے میں منشاء الٰہی نے بنو اُمیہ میں سے سرکار دو عالم کے ایک ایسے غلام کو چنا جو آقا حضور کی غلامی کو بادشاہی پر ترجیح دیتا تھا۔ اس عظیم خلیفہ نے اپنے ہی خاندان کے پیدا کردہ فتنوں کا بہت تدبر اور خوش اسلوبی سے قلع قمع کیا اور دین وخلافت کا صحیح چہرہ اقوام عالم کے سامنے بڑے فخر سے پیش کیا۔ اپنے دور کے فتنے ختم کر کے شریعت وسنت کو رواج دینا ہی مجدد کا اصل کام ہوتا ہے۔ قوم کو جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اُن مشکلات کے حل کی صلاحیتوں کے ساتھ مجدد کو پیدا فرماتا ہے۔

سن 99 میں تخت نشین ہوتے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انقلابی اصلاحات نافذ کیں۔

۱) آپ نے پُرتکلف شاہی لباس پر سادہ کپڑوں کو ترجیح دی۔ شاہی سواری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے ذاتی حجرے پر ہی اکتفا کیا۔ آپ کی زوجہ فاطمہ بنت عبدالملک جو ایک سابق شہنشاہ کی بیٹی دو سابق شہنشاہوں کی بہن اور موجودہ خلیفہ کی زوجہ تھیں اس کے باوجود آپ نے اُن سے ایک ایک چھلا تک اُتروا کر سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیا اُن کے باپ عبدالملک بن مروان نے انہیں ایک نہایت قیمتی ہیرا دیا تھا۔ جسے فاطمہ بنت عبدالملک جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں جب یہ قیمتی ہیرا بیت المال میں جمع کرانے کی بابت فاطمہ نے کچھ پس وپیش کی تو آپ نے صاف کہہ دیا فاطمہ یا تو یہ ہیرا سرکاری خزانے میں دے دو یا مجھے چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ لہٰذا آپ کی وفا شعار بیوی نے وہ قیمتی ہیرا شوہر کی محبت پر قربان کر کے بیت المال میں دے دیا۔

خلیفہ ہونے سے پہلے آپ خوشبویات وعطریات کے بڑے دلدادہ تھے جس گلی سے آپ گزرتے لوگ اعلیٰ درجہ کی بیش قیمت خوشبو سے اندازہ کر لیتے کہ عمر بن عبدالعزیز ادھر سے ہو کر گزرے ہیں جو لباس خوشبو آپ استعمال کرتے شہر بھر میں اُس کا فیشن چل نکلتا۔ لیکن بار خلافت اُٹھاتے ہی آپ نے اپنا یہ ذوق سادگی پر نچھاور کر دیا اور عطریات کا جتنا ذخیرہ تھا وہ سب سرکاری خزانے کو دے دیا اس کے علاوہ قیمتی قالینیں سامان آسائش حتیٰ کہ لونڈیاں اور غلام بھی بیت المال کے حوالے کر دیئے۔ مختلف عہدوں پر کام کرنے کے دوران جو جاگیریں آپ کو انعام شاہی میں عطا ہوئی تھیں ان سب کی دستاویزات جامع مسجد دمشق میں مسلمانوں کے بھرے مجمع میں پھاڑ کر پرزے پرزے کر ڈالیں اور جاگیریں اصل مالکوں کو لوٹا دیں۔

۲) مروان نے ''باغ فدک'' پر قبضہ جما رکھا تھا آپ نے ایک جرأت مندانہ اقدام کر کے باغ فدک سے اپنے خاندان والوں کا قبضہ چھڑایا اور اسے ''وقف املاک'' میں شامل کیا۔ باغ فدک کا مسئلہ ایک باغ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک نظریاتی اور فکری مسئلہ بھی بنا ہوا تھا۔ شرعی قانون کے تحت حضرات انبیاء کرام کی جائیداد مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے لئے وقف ہوتی ہے وہ کسی

مخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی حتیٰ کہ انبیاء کرام کی اولاد کی بھی نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس شرعی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''جو چیز رسول اللہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی نہیں دی اس پر میرا یا کسی اور کا کیا حق ہو سکتا ہے''۔ دوسری طرف شریعت کے قانون کا احیاء ہوا۔ اور ایک بہت بڑے فتنے کا بھی سد باب ہوا کہ جو لوگ باغ فدک کے معاملے کو اُچھال کر اپنے فرقہ وارانہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے وہ ناکام و نامراد ہوئے۔

۳) اموی دور میں ایک اور بدعت بڑی جڑ پکڑ گئی تھی وہ تھی خطبہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو بُرا بھلا کہنا۔ جو بالخصوص خانوادۂ نبوت اور بالعموم ساری اُمت کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ اس عادت بد سے مسلمانوں کے دل چھلنی ہو رہے تھے اور اختلافات کی خلیج دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اہل اقتدار کی اس بد خصلتی کے باعث شرفاء اہل بیت سیاسی اور ریاستی معاملات سے بددل اور بے تعلق ہوتے جا رہے تھے اور سیاسی شعبدے باز اور پروفیشنل درباریوں کی چاندی ہو رہی تھی۔ آپ نے اس حساس مسئلہ کو پہلی فرصت میں ذاتی توجہ سے حل کیا اور پوری اسلامی دنیا میں اس بدعت کی بیخ کنی کی اور حضرت علی کی توہین والے کلمات خطبوں سے خارج کر کے آیت کریمہ ''**ان اللہ یامر بالعدل والاحسان**'' شروع کروائی جو آج تک خطبوں میں پڑھی جاتی ہے۔

۴) حُب علی کی آڑ میں ایک مخصوص گروہ خلیفہ راشد حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی گستاخی کرتا تھا آپ نے اُن کے لئے بھی سزا مقرر کی اور ایک گستاخ کو اپنی موجودگی میں دُرے لگوائے۔

۵) آپ سے پہلے شاہی درباروں میں سرکاری وظیفہ خوار، چھچھورقسم کے شاعر اور قصیدہ خوان بھاری تنخواہوں پر رکھے جاتے تھے آپ نے ایسے سب جھوٹے شاعروں اور قصیدہ خوانوں کو فارغ کر دیا اور اہل علم دانش حضرات کو دربار میں جگہ دی جس سے معاشرے میں علمی ذوق کو مہمیز اور بے سروپا جھوٹی شاعری کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

۶) ایک بہت بڑی علمی خدمت آپ نے یہ انجام دی کہ احادیث نبوی کے جو مقدس

ذخیرے صحابہ و تابعین کے پاس محفوظ تھے۔ انہیں گورنر مدینہ حضرت قاضی ابو بکر بن خرم کی نگرانی میں جمع کروایا اور اُن کی نقول تیار کروا کر اسلامی دنیا کے تمام بڑے شہروں میں رکھوائیں تا کہ اہل حکومت و سیاست اور اہل علم و دانش برابر اُن سے استفادہ کر کے اپنے دین و دنیا سنواریں۔

۷) جو لوگ دنیاداری سے کنارہ کش ہو کر دین کی بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بیت المال سے اُن سب کا وظیفہ مقرر کیا تا کہ وہ دلجمعی سے دینی امور انجام دیں اور اُمت کی راہنمائی کا فریضہ احسن طریقے سے ادا کریں۔

۸) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ یہ کیا کہ شاہی خاندان کے دل و دماغ سے شاہانہ نخوت و غرور کا جنازہ نکال کر رکھ دیا اور انہیں بھولے ہوئے سبق پڑھا دیئے۔ اقتدار کا نشہ آدمی کو بدمست کر ڈالتا ہے۔ جس کے سر پر اقتدار کا نشہ سوار ہو نصیحت اُس پر کارگر نہیں ہوتی وہ خود کو عام لوگوں سے اعلیٰ اور خاص قسم کی مخلوق سمجھنا شروع کر دیتا ہے ایسے لوگوں کو حق کا راستہ دکھانا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ کٹھن مرحلہ بڑے تدبر تحمل اور جوانمردی سے طے کیا۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک ماتحت افسر کو لکھا ''کسی شخص کو اس لئے ترجیح نہ دو کہ یہ شاہی خاندان کا فرد ہے۔ میرے لئے سب مسلمان برابر ہیں''۔

ایک مرتبہ آپ کا چھوٹا سالا مسلمہ بن عبدالملک کسی مقدمے میں حاضر دربار ہوا۔ چونکہ وہ ایک سابق بادشاہ کا بیٹا دو سابق بادشاہوں کا چھوٹا بھائی اور موجودہ خلیفہ کا سالا تھا لہٰذا خود کو معزز سمجھ کر عدالت کے اُس حصے میں بیٹھنے لگا جہاں معززین اور عمائدین بیٹھتے تھے جیسے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نگاہ پڑی آپ نے کوئی لحاظ کئے بغیر اُسے کہا مسلمہ تم ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں آئے ہو جب تک تمہاری بے گناہی ثابت نہ ہو جائے تم معززین کے درمیان نہیں بیٹھ سکتے۔ لہٰذا تم عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو جاؤ۔

ایک مرتبہ آپ کے سالے ولید کے بیٹے عباس پر کسی غیر مسلم نے دعویٰ کر دیا کہ عباس نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔ آپ نے عباس کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ عباس نے کہا میرے والد ولید نے یہ زمین مجھے بطور جاگیر دی تھی یہ دیکھئے اس کے کاغذات بھی

میرے پاس موجود ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا ''میں ولید کے دیئے ہوئے کاغذات پر اللہ کی کتاب کو ترجیح دیتا ہوں''۔ یہ کہہ کر آپ نے وہ جاگیر عباس سے چھین کر اس غیر مسلم کے حوالے کر دی۔

اسی طرح شاہی خاندان کے بہت سے افراد کو مختلف وقتوں میں مختلف بادشاہوں سے جو جاگیریں عطا ہوئی تھیں وہ سب جاگیریں چھین کر ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دیں آپ کے ان انقلابی اقدامات کے باعث آپ کے خاندان والے آپ کی جان کے دشمن ہو گئے ایک طرف پوری اسلامی دنیا آپ کے گن گا رہی تھی ہر زبان پر آپ کے چرچے تھے مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں آپ کے لئے دعائیں ہوتی تھیں غریب اور نادار لوگ آپ کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے دوسری طرف چند غنڈہ گرد عناصر اور دولت کے پجاری آپ کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ آپ نے کبھی ایسے لوگوں کی پرواہ نہ کی اور اُن کی دشمنی مول لے کر اپنی آخرت سنوارتے رہے اور اُمت کی خدمت کر کے وہ مقام حاصل کر لیا کہ بڑے بڑے تابعین بھی آپ پر رشک کرتے تھے بالآخر دو سال پانچ ماہ کی شاندار اور مثالی حکومت کے بعد، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور عیاشوں کا ٹولہ اُمت کے اس عظیم محسن کو خفیہ طریقے سے زہر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جب آپ بیمار ہوئے تو آپ کو اس سازش کا پتہ چل چکا تھا کہ آپ کو زہر دے دیا گیا ہے۔ مگر آپ نے نہ کوئی تحقیقات کروائیں نہ کسی سے انتقام لیا بس راضی برضا رہے اور بیس دن بیمار رہ کر رجب ۱۰۱ھ میں دربار خدا میں سرخرو ہو گئے۔ حضرت مالک بن دینار فرمایا کرتے تھے لوگ مجھے زاہد کہتے ہیں حالانکہ زاہد تو عمر بن عبدالعزیز ہیں جن کے پاس دنیا آئی اور انہوں نے ترک کر دی۔ امام شافعی سفیان ثوری اور امام احمد رضا نے آپ کو خلیفہ راشد لکھا ہے۔ دوسری صدی کے تمام بڑے علماء نے آپ کو اُمت کا پہلا مجدد قرار دیا ہے اور مجدد وہی ہوتا ہے جو علماء کا متفق علیہ ہو یعنی ''علماء اس کی طرف اشارہ کریں کہ یہ مجدد ہے''۔ بقول مولانا حسن علی رضوی ''شاگردوں، مریدوں اور بچوں کے کہنے سے کوئی مجدد نہیں بن جاتا''۔

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا

حضرت سیدہ شفیقہ رابعہ بصری تبع تابعیہ تھیں۔ ''سکینۃ العارفین'' میں ہے کہ آپ چار بہنیں تھیں آپ چوتھی بہن تھیں۔ اسی وجہ سے آپ کا نام رابعہ رکھا گیا تھا جس رات آپ پیدا ہوئی تھیں آپ کے والد رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ آپ کے بدن کو لپیٹا جاتا۔ دیئے میں اتنا تیل نہ تھا کہ روشنی رہتی۔ آپ کی والدہ رحمۃ اللہ علیہا نے آپ کے والد کو کہا کہ فلاں ہمسائے کے پاس جاؤ اور تیل لے آؤ۔ رابعہ کے والد نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اللہ کے بغیر کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے لیکن مجبوراً ہمسائے کے دروازے پر آئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ واپس آگئے اور مایوس ہو کر سو گئے۔

خواب میں رسول خدا ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا غم نہ کرو۔ یہ بچی جو آج پیدا ہوئی ہے۔ یہ سیدہ ہے۔ شفیقہ ہے۔ اس کی روحانی روشنی دنیا کو روشن کرے گی اور میری امت کے ستر ہزار لوگ اسی کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔ اگر تم غربت کی وجہ سے غمزدہ ہو تو صبح اٹھ کر امیر بصرہ کے پاس جانا اور میری طرف سے ایک رقعہ لکھ لینا۔ اور کہنا کہ تم ہر رات ایک سو بار درود پاک پڑھا کرتے تھے اور جمعرات کو چار سو بار درود پڑھتے تھے۔ اس جمعرات کو درود پڑھنا بھول گئے ہو۔ اس کا کفارہ چار سو دینار بنتا ہے۔ حامل رقعہ کو دے دو۔ امیر بصرہ سے چار سو دینار لے کر خرچ کر لینا۔

حضرت رابعہ کے والد نیند سے اٹھے، خط لکھا اور صبح امیر بصرہ کے پاس جا پہنچے۔ امیر بصرہ کے حاجب کو خط دیا۔ تاکہ وہ امیر بصرہ کی خدمت میں پیش کرے۔ امیر بصرہ خط پڑھ کر بڑے خوش ہوئے چار سو دینار پیش کئے۔ دس ہزار دینار بطور شکرانہ عام غریبوں میں تقسیم کئے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے یاد فرمایا ہے۔

حضرت رابعہ ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچی تھیں کہ آپ کے والدین انتقال کر گئے ان دنوں ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ آپ کی دوسری بہنیں تلاش رزق کے لئے ادھر اُدھر چلی گئیں حضرت رابعہ بھی بصرہ سے نکلیں۔ کسی سفاک آدمی نے آپ کو پکڑا اور فروخت کر دیا۔ رابعہ دن کو اپنے مالک کے پاس خدمت گزاری میں مصروف رہتیں۔ رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتیں ایک رات حضرت رابعہ سجدہ میں سر رکھے اللہ کی بارگاہ میں رورو کر التجا کر رہی تھیں۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا اور آزاد ہوتی تو تیری اطاعت وعبادت میں ذرہ بھر بھی کوتاہی نہ کرتی لیکن مجھے ایسی شخص کی خدمت گزاری کے لئے وقت دینا پڑتا ہے جو تیرے مقام سے ناواقف ہے۔ دعا کے دوران آپ کے سر پر ایک نور خود بخود روشنی پھیلا رہا تھا۔ حضرت رابعہ کے مالک نے حضرت رابعہ کو اس حالت میں دیکھا۔ نیند سے اٹھ بیٹھا۔ بڑا متفکر تھا اور دل میں سوچنے لگا۔ میں ایسی نیک بی بی کو اپنی خدمت میں مصروف رکھتا ہوں۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں۔ مجھے تو ان کی خدمت کرنا چاہئے۔ دوسرے دن صبح کے وقت حضرت رابعہ کو آزاد کر دیا۔ حضرت رابعہ ایک صحرا میں چلی گئیں اور ہمہ وقت یاد خداوندی میں بسر کرنے لگیں۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجالس میں کبھی کبھی حاضر ہوتیں۔ حضرت خواجہ حسن بصری بھی آپ سے نہایت شفقت فرماتے ایک دفعہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اپنے چند دوستوں کو لے کر حضرت رابعہ بصری کے گھر گئے اس وقت حضرت رابعہ کے گھر چراغ نہیں تھا۔ مہمانوں کی سہولت کے لئے آپ نے اپنی انگشت شہادت کو اپنے لبوں سے چھوا اور چراغ کی طرح روشن کر دیا اور اس طرح صبح تک چراغ جلتا رہا۔

ایک دن خواجہ حسن بصری نے رابعہ بصریہ کو مشورہ دیا کہ نکاح کر لو۔ رابعہ نے کہا کہ میں فنافی اللہ ہو چکی ہوں۔

تذکرہ اولیاء میں حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ایک بار حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا ایک قافلے میں حج بیت اللہ کے ارادے سے نکلیں۔ ایک صحرا میں سے گزر رہی

تھیں گدھے پر سامان لدا ہوا تھا۔ صحرا کے درمیان پہنچیں تو گدھا مر گیا۔ قافلہ والوں نے کہا۔ آپ کا سامان ہم اٹھا لیتے ہیں۔ فرمانے لگیں میں تمہارے بھروسہ پر سفر نہیں کر رہی تھی۔ مجھے تو اپنے اللہ پر بھروسہ اور توکل ہے۔ قافلہ چلا گیا اور اکیلی رہ گئیں۔ سجدہ میں سر رکھ کر دعا کی۔ اے اللہ! کیا بادشاہ ایک مسافر عورت سے یہی سلوک کیا کرتے ہیں؟ پہلے تو مجھے اپنے گھر کی زیارت کے لئے سفر اختیار کرنے کی ہمت دی۔ پھر راستہ میں لا کر میرا گدھا چھین لیا۔ اور مجھے تن تنہا صحرا میں لا کھڑا کیا۔ ابھی دعا پوری نہیں ہوئی تھی کہ گدھا کان جھاڑتا ہوا اٹھا۔ حضرت بی بی نے رخت سفر دوبارہ لادا۔ ابھی راہ میں ہی تھیں کہ دیکھا کہ کعبۃ اللہ کے انوار آپ کے استقبال کو آرہے ہیں۔ حضرت رابعہ نے دیکھ کر فرمایا۔ مجھے کعبہ نہیں رب کعبہ چاہئے۔ اسی سال سلطان ابراہیم بن ادھم فاروقی رحمۃ اللہ علیہ حج بیت اللہ کو گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ کعبۃ اللہ اپنے مقام پر نظر نہیں آ رہا۔ حالانکہ آپ گھر سے چلے تو ہر قدم پر دو دو نفل نماز ادا کرتے گئے اور اسی طرح چودہ سال لگے۔ فرمانے لگے کیا میری بینائی میں کمی آگئی ہے کہ بیت اللہ نظر نہیں آرہا۔ ہاتف نے آواز دی آپ کی نظر کی کوتاہی نہیں دراصل کعبۃ اللہ ایک نیک بی بی کے استقبال کو گیا ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم فاروقی نے دیکھا کہ حضرت رابعہ بصریہ آرہی ہیں۔ اب کعبہ اپنی جگہ قائم ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم فاروقی نے فرمایا۔ رابعہ یہ کیا شور کرامت ہے جو تم نے دنیا میں برپا کر رکھا ہے۔ کہ کعبۃ اللہ کو اپنے استقبال کے لئے بلا رہی ہو۔ حضرت رابعہ فرمانے لگیں۔ ابراہیم شور تو تم نے برپا کر رکھا ہے کہ چودہ سال سے ایک ایک قدم پر نفل ادا کرتے آرہے ہو۔ اور چودہ سال دیر کر کے اللہ کے گھر میں حاضر ہوئے ہو۔ حضرت ابراہیم بن ادھم فاروقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ رابعہ مجھے چودہ سال اللہ کی نماز پڑھتے صحرا میں گزرے۔ آپ نے فرمایا تم چودہ سال اللہ کی نماز میں رہے میں عمر بھر اللہ کے نیاز میں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ تم اللہ کے گھر پہنچے۔ تو وہ اپنی جگہ پر نہ تھا۔ میں نیاز مندانہ حاضر ہوئی تو وہ مجھے لینے آگے بڑھا۔

بزرگ حضرات حضرت رابعہ بصریہ کی زیارت کو گئے۔ دونوں بھوکے تھے اور تھکے

ہوئے تھے۔ وہ دل میں کھانے کی آرزو لئے پہنچے۔ حضرت رابعہ نے دو روٹیاں جو رات کی پڑی ہوئی تھیں پیش کیں۔ مگر اسی وقت دروازے پر ایک سائل نے آواز دی۔ حضرت رابعہ نے دونوں روٹیاں اُٹھائیں اور سائل کو دے دیں۔ دونوں مہمان بڑے حیران ہوئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ایک کنیز دروازے میں داخل ہوئی اس کے سر پر ایک دسترخوان تھا اور کہنے لگی میری مالک نے یہ روٹیاں آپ کے لئے بھیجی ہیں۔ حضرت رابعہ نے روٹیاں گنیں تو اٹھارہ تھیں۔ حضرت رابعہ نے کہا یہ روٹیاں واپس لے جاؤ۔ یہ میرے لئے نہیں کسی اور کی ہوں گی تمہاری مالک کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ واپس گئی تو واقعی مالک نے کہا میں تو بیس روٹیاں بھیجنا چاہتی تھی۔ بیس روٹیاں دیں تو وہ کنیز دوبارہ حاضر ہوئی۔ حضرت رابعہ نے بیس روٹیاں لیں اور مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ دو کے بدلے تو اللہ تعالیٰ نے بیس روٹیاں مقدر کی ہوئی تھیں۔ مہمان بزرگ رابعہ کے اس انداز مہمان نوازی کو دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ حضرت رابعہ نے فرمایا جب تم میرے پاس آئے تو مجھے احساس تھا کہ تم بھوکے ہو۔ مگر میرے پاس صرف دو روٹیاں تھیں۔ ان دو روٹیوں سے تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ سائل آیا۔ میں نے اللہ سے تجارت کی۔ کہ وہ ایک کے بدلے دس دیتا ہے۔ میں دو روٹیاں اس کی راہ میں دے دیں مجھے یقین تھا اللہ تعالیٰ ضرور دو کے بدلے 20 دے گا۔

وفات کے وقت آپ کی عیادت کے لئے لوگ پہنچے۔ کہنے لگیں۔ اٹھو! میرے پاس اللہ کے فرشتے آرہے ہیں انہیں بیٹھنے کی جگہ دو۔

یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

اس کے بعد کوئی آواز نہ آئی۔ لوگ پھر آپ کے پاس آئے۔ دیکھا کہ آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

حضرت رابعہ کی وفات 158ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار آج تک بصرہ میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

جاہل اور ملنگ قسم کے لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ دنیا میں اڑھائی قلندر تھے۔ (۱) شہباز قلندر۔ (۲) حضرت بوعلی قلندر اور آدھی رابعہ بصری قلندر۔ یہ بالکل بے دینی اور حماقت ہے کیونکہ حضرت شہباز قلندر اور حضرت بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہما مقام و مرتبہ میں آپ سے بہت چھوٹے ہیں۔ آپ نے تابعین کی زیارت کی ہے لہٰذا آپ تبع تابعین کے عظیم الشان منصب پر فائز ہیں۔ خاص طور پر حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ حضرت حسن بصری کی تربیت یافتہ ہیں وہاں کسی قلندر کی رسائی ہو سکتی۔ ایسی بے سروپا باتیں آپ کی شان میں توہین کے مترادف ہیں۔ قارئین اگر آپ بھی اس واہم میں مبتلا ہیں تو فوراً توبہ کریں۔

حضرت داؤد طائی علیہ الرحمۃ

تین براعظموں پر پھیلی ہوئی عظیم اسلامی سلطنت کا چیف جسٹس ایک بوریا نشین فقیر کے سامنے دوزانو بیٹھا عہدوں اور منصوبوں کی بے ثباتی اور فقیر غیور کی حقیقی شوکت وسطوت کا زبان حال سے اعتراف کررہا تھا۔

حضرت داؤد طائی نے میزبانی کے تقاضوں سے فارغ ہو کر حضرت امام ابو یوسف سے دریافت فرمایا جناب قاضی القضاۃ آج ہم فقیروں کے ہاں کیسے آنا ہوا۔ حضرت امام ابو یوسف نے عرض کیا حضور دارالخلافت بغداد کے تاجور امیر المومنین خلیفہ ہارون الرشید حضور کے زہد وتقویٰ سے بڑے متاثر ہیں اور عقیدت مندی کے جذبات کے ساتھ آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں اگر آپ پسند فرمائیں تو کسی روز میں انہیں ساتھ لے کر آپ کے آستانہ پر حاضری دوں۔

آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا نظر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے جبکہ میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔

امام ابو یوسف نے لجاجت سے عرض کیا حضور ایسا نہ کہئے کیونکہ میں خلیفہ وقت سے وعدہ کر چکا ہوں کہ انہیں آپ کی زیارت کراؤں گا۔ آپ نے فرمایا مجھ سے پوچھے بغیر تم نے اس سے وعدہ کیوں کرلیا امام ابو یوسف نے حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے کہا سرکار مجھے آپ کی خوش اخلاقی اور غریب نوازی سے امید تھی کہ آپ مجھے مایوس نہیں فرمائیں گے۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ ابو یوسف تم نے غلطی کی اور میرے متعلق ٹھیک اندازہ نہیں لگایا کیونکہ میں دنیاداروں سے نفرت کرتا ہوں بادشاہ کو ہرگز ہرگز میرے ہاں نہ لانا۔ آپ نے دوٹوک جواب سے مایوس ہو کر امام ابو یوسف نے واپس آ کر سارا ماجرہ خلیفہ وقت کے گوش گزار کیا تو خلیفہ ہارون الرشید بھی

غمگین ہوا کیونکہ خلیفہ ہارون الرشید ایک خوش عقیدہ بادشاہ تھا اور بزرگوں کی زیارت اور خدمات کا بڑا شائق تھا اور تہیہ کر چکا تھا کہ داؤد طائی جیسی عظیم ہستی سے ضرور ملاقات کرے گا لہٰذا اس نے اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی کہ آپ نیک خاتون ہیں ہر چھوٹا بڑا آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اگر آپ داؤد طائی سے میرے لئے ملاقات کا وقت لینے خود تشریف لے جائیں تو مجھے امید ہے حضرت انکار نہ فرمائیں گے۔ آخر خلیفہ وقت کی والدہ خیرزان کو آپ کے آستانہ پر حاضر ہونا پڑا حاضر ہو کر انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

آپ نے فرمایا خیرزان کیا تمہیں آخرت کی فکر نہیں۔ انہوں نے کہا تو پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوں۔ آپ نے فرمایا میں ایک شرط پر تمہاری بات مانوں گا کہ تم ہارون کو پابند کر دینا کہ مجھے دنیا کی دولت دینے کی کوشش نہ کرے خیرزان نے یہ شرط قبول کر لی ہارون اور امام ابو یوسف خیرزان کے ہمراہ آستانہ پر پہنچے۔ ہارون الرشید نے بڑی عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے خلیفہ ہارون الرشید سے سوال کیا کہ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو۔ خلیفہ گویا ہوا چونکہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ میں جسے چاہوں ملازم رکھ لوں جسے چاہوں خرید لوں لیکن آپ کی بے نیازی اور استغنا ہے جو میں نہیں خرید سکتا۔

پھر ہارون الرشید نے عرض کیا حضرت مجھے کوئی نصیحت فرمائیں تو آپ نے فرمایا میری نصیحت صرف یہ ہے کہ آئندہ کبھی میرے پاس نہ آنا۔

خلیفہ نے کچھ نذرانہ دینے کی کوشش کی تو آپ نے خیرزان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا میں نے جو شرط رکھی تھی تم نے اس کا کچھ پاس نہ کیا خیرزان بولیں آپ زیادہ نہ لیں میرے بیٹے کا ایک دینار تو ضرور قبول فرمائیں آپ نے فرمایا "میرے پاس اتنی رقم ہے کہ زندگی بھر کے لئے کافی ہے"۔ یہ سب سن کر امام ابو یوسف نے آپ کے تیور بھانپ لئے اور بادشاہ کو اشارہ کیا کہ تکرار و اصرار نہ کریں۔ وہ داؤد کے مزاج سے واقف ہیں انہوں نے ایک مرتبہ جو کہہ دیا اس پر کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرنے والے لہٰذا اجازت لے کر ہارون الرشید رخصت ہو گیا۔

ایک دن امام ابو یوسف کو داؤد طائی کا جملہ یاد آیا کہ "میرے پاس اتنی رقم ہے کہ زندگی بھر کے لئے کافی" تو انہوں نے ایک قاصد کے ذریعے یہ معلوم کرایا کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے اور آپ کا ماہانہ خرچ کیا ہے آپ نے قاصد سے فرمایا میرے پاس 10 درہم ہیں اور میرا مہینہ بھر کا خرچ آدھا درہم ہے اور امام ابو یوسف سے کہنا اگر تم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہو تو میں بھی انہی کا شاگرد ہوں اور یہ سمجھ چکا ہوں کہ تم میری رقم سے میری زندگی کا اندازہ کرنا چاہتے ہو۔

امام ابو یوسف کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ آپ ٹھیک بیس ماہ بعد خلد کے راہی ہوئے ہارون الرشید اور امام ابو یوسف کو آپ کا وہ جملہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ "میرے پاس اتنی رقم ہے کہ زندگی بھر کے لئے کافی ہے"۔

چھٹی صدی ہجری کے مجدد

حضرت سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں بغداد کے بعض عباسی خلفاء نے یونانی لٹریچر کا وسیع پیمانے پر عربی میں ترجمہ کروایا لیکن تاریخی غلطی یہ ہوئی کہ ایک تو اہل نظر اور اہل دل ظاہری و باطنی علوم کے ماہرین کی بجائے صرف ظاہری علوم کے حامل اور لسانیات کے ماہرین کو ہی اس کام پر مامور کیا گیا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ یونانی لٹریچر میں یہ جانچ اور پرکھ نہ کی گئی کہ وہ کہاں کہاں اسلامی نظریات سے متصادم ہے۔ جس کے باعث امت کے پڑھے لکھے طبقے میں گمراہ کن یونانی فلسفیانہ نظریات غیر محسوس طریقے سے راسخ ہونے لگے۔ اور نوبت ایں جا رسید کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات صفات تک کو بھی فلسفہ کی رنگینیوں میں رنگ کر پیش کیا جانے لگا۔ یونانی فلسفہ آہستہ آہستہ اسلامی سوسائٹی میں علم وفضیلت کا معیار بنتا جا رہا تھا۔ قرآن وحدیث کے مقدس علوم کو پس پشت ڈال کر لوگ جدید فلسفہ پڑھنے کی طرف مائل ہو رہے تھے اور اس سارے سلسلے کو قانون کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شاعر کی زبان میں۔

تعلیم کے بنے تھے معیار کافرانہ
قانون کے لگے تھے انبار کافرانہ
تہذیب کے ہوئے تھے اطوار کافرانہ
پروان چڑھ رہے تھے افکار کافرانہ

فلسفہ ایک وباء کی طرح معاشرے میں پھیل گیا تھا۔ جگہ جگہ بحث ومناظرہ کی بے سود محفلیں جمی تھیں۔ اور یہ بحثیں فروعی اختلافات سے آگے بڑھ کر خود ذات واجب الوجود کو موضوع سخن بنا رہی تھیں۔ ایسے ایسے سوالات اٹھائے جا رہے تھے۔ کہ

☆ آیا خدا کا وجود ہے بھی یا نہیں؟

☆ قیامت آسکتی ہے یا نہیں؟

☆ اگر خدا ہے تو کس طرح ہے؟

☆ قرآن حادث ہے یا قدیم؟

اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں صورت احوال یہ تھی۔ کہ

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

جب پرانی وضع کے لوگ، سادہ لوح مسلمان اور علمائے کرام نئی روشنی کے مونہہ سے ایسے سوالات سنتے تو ان کے مونہہ تکتے رہ جاتے۔ اہل ایمان کے ایمانی تقاضے اللہ رب العزت کے حضور مجسم دعا بن جاتے۔ اور ان کی بے بسی آنسوؤں کا لباس پہن لیتی۔ عوام الناس پڑھے لکھے طبقے کے باہمی اختلافات سے متنفر ہوکر ذہنی انتشار کا شکار اور اسلامی علمی ورثہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

ایسے ماحول میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی بات۔ کہ "ہر صدی کے سرے پر اللہ تعالیٰ اس امت میں ایسا مجدد پیدا کرے گا جو اس دین کی تجدید کرے گا"۔ (ابوداؤد) کے مطابق حضرت محی الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خزاں رسیدہ گلشن میں ہوا کا تازہ جھونکا بنا کر بھیجا۔

یونانی فلسفے کا طوفان بھی بغداد میں آیا ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت نے بھی تجدید دین کی لئے بغداد ہی کو منتخب فرمایا۔ حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغداد میں پانچ سو گیارہ ہجری میں باقاعدہ تدریسی کام کا آغاز فرمایا۔ اور کچھ ہی عرصہ میں آپ کے مدرسے میں ساڑھے سات سو کے قریب طلباء نے داخلہ لے لیا۔ وہ علوم دینیہ کے پاکیزہ چشموں سے اپنے ایمان وایقان اور اعتقاد ونظریات کی کھیتیوں کو سیراب کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت

نے اپنے وعظ کے ذریعے عام لوگوں کے ذہنوں کو مثبت انداز میں بدلنا شروع کیا۔ آپ نے لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ جدید علوم پڑھ کر آپ دربار خلافت میں ملازمت اختیار کر سکتے ہیں، کسی دنیاوی تعلیمی ادارے میں نوکر ہو سکتے ہیں؛ کسی امیر یا نواب کے اطالیق یا منشی لگ سکتے ہیں لیکن اس سے آپ اپنے ایمان کی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، اللہ کی توحید سے آپکا ناطہ ٹوٹ جائے گا آپ حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کی دنیا آباد ہو جائے گی مگر آخرت برباد ہو جائے گی۔ معاشرے میں آپ کا اسٹیٹس بن جائے گا لیکن قبر اندھیری ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں آپ ایک مثال دیا کرتے تھے کہ ایک آدمی اگر بھوکا ہے تو کسی نہ کسی طرح اس کا گزر ہو جائے گا لیکن ایک آدمی کے آگے رنگ برنگے کھانے چنے ہوئے ہیں مگر اس میں زہر کی آمیزش ہے بتایئے کہ اس کو موت سے کون بچا سکتا ہے۔ بتایئے کہ وہ بھوکا رہنے والا شخص عقل مند ہے یا یہ زہریلا کھانا کھانے والا لہٰذا اس چند روزہ دنیا میں فقر و قناعت کے ساتھ زندگی گزار لو لیکن دنیا کی رنگینی پر فریفتہ ہو کر دین کو ہاتھ سے نہ جانے دو"۔

رفتہ رفتہ آپ کے اس سادہ اور پراثر تبلیغی طریق کار نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا شروع میں آپ کی محافل میں چند درویش اور فقیر ہوا کرتے تھے لیکن آپ کی بے لوثی، خلوص، ایثار اور لگن نے معاشرے کے ہر فرد کو اپنی طرف کھینچ لیا یہاں تک کہ آپ کے مواعظ میں ایک ایک لاکھ کا مجمع ہونے لگا اور قلم دوات سے آپ کے ملفوظات لکھنے والے حضرات کی تعداد بسا اوقات چار چار ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ آپکی تقریر ایسی پر اثر اور شعلہ نوا ہوتی کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے اور بعض آپ کے قدموں سے لپٹ کر ہچکیاں بھرتے۔ بعض صبر وضبط کا چارہ نہ رکھتے اور اپنے گریبان پھاڑ لیتے اور بعض شہیدانِ مہر ووفا تو آپ کے کسی عارفانہ جملے پر جان تک لٹا دیتے اور بارگاہ الٰہی میں سرخرو ہو کر حیات جاودانی کا شرف پا لیتے۔

چھٹی صدی ہجری کی پانچویں دھائی میں عباسی حکمرانوں کا رعب و دبدبہ اپنے عروج پر تھا۔ عوام تو عوام خواص میں بھی دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ بڑے بڑے لوگ بھی سہمے ہوئے زندگی گزار رہے تھے۔ ایسے میں حضرت نے ایک انقلابی قدم اٹھایا کہ تدریس و تبلیغ کے ساتھ ساتھ سیاست کی تطہیر کا کام بھی شروع کر دیا اور حکمرانوں کو اپنی زبردست تنقید کا نشانہ بنایا جس سے ایک طرف تو حکمرانوں کی فرعونیت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف پسے ہوئے عوام کو بڑا حوصلہ ملا اور ان پر حاکمان وقت نے جو بے جا رعب جما رکھا تھا آپ کی بے خوف تنقید نے وہ جال ادھیڑ کر رکھ دیا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یقیناً قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ایک عباسی خلیفہ مستنجد باللہ ایک دن حضرت کے مدرسے میں آیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی آپ کی نذر کی۔ آپ نے وہ تھیلی اپنی مٹھی میں لیکر بھرے مجمع میں نچوڑی تو اس میں سے خون بہنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر خلیفہ کا سارا کر وفر اور شاہی جاہ وجلال خاک میں مل گیا اور عوام اس تماشے پر خوب لطف اندوز ہوئے۔ پھر آپ نے حاکم وقت کو للکارا اور اشرفیوں کی تھیلی کو خلیفہ کی طرف اچھالتے ہوئے جلالی انداز میں فرمایا۔ ''عوام کا خون نچوڑتے ہو اور ہمیں نذرانے دیتے ہو''۔

پانچ سو چون ہجری میں لوگوں کے زبردست اصرار پر وسطی ایشیا کے شہروں طوس' بسطام ایران کے شہروں تبریز اور ہمدان عراق کے شہروں' موصل' کوفہ' نجف اور شام کے شہروں حلب اور دمشق میں اپنے مدرسے کی شاخیں کھولیں اور اپنے رشد و ہدایت کا دائرہ پوری اسلامی دنیا تک بڑھا دیا۔

پانچ سو ستاون ہجری میں آپ نے تربیت یافتہ خلفاء اور تلامذہ کو تبلیغی اغراض و مقاصد کے تحت مختلف براعظموں' ملکوں اور شہروں میں تعینات کیا۔ جن میں حضرت ہاشم بن زیاد' حضرت طلحہ بن اسد' حضرت عبداللہ بن شہاب' حضرت عبدالرحمٰن بن مسعود' حضرت زبیر بن وھب اور حضرت جعفر بن سعید معروف ہیں۔ آپ کے یہ شاگردان عزیز مریدان

باصفا راہ خدا میں صابر و شاکر تھے ان میں حوصلہ مندی اور ایثار مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ سارے کے سارے درویش تھے جو سادہ کھانا کھاتے معمولی لباس میں گزارہ کرتے اور دینی علوم کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ خود فقر و فاقہ میں رہتے ہوئے ہمیشہ امت کے دکھی اور پریشان حال لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرتے اور ہر دکھ درد میں ان کے شریک رہتے۔ آپ کے بعض خلفاء مالدار بھی تھے لیکن انہوں نے فقر اور درویشی اختیار کر رکھی تھی اور اپنا مال راہ خدا میں لٹا کر صبر و شکر کی حلاوت سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ یہ سب حضرات علم و فضل کے کوہ گراں دریائے فقہ کے غواص، حدیث و تفسیر کے شناور، ادب و تاریخ کے ماہر اور فصاحت و بلاغت کے پیکر تھے۔ ان کی گفتگو لوگوں کے ذہنوں کو متوجہ کرتی اور ان کا کردار پرائے دیس کے اجنبی لوگوں کے دل موہ لیتا۔ ان کی حکمت بھری باتیں اہل علم کو ان کے آگے جھکاتیں اور ان کا عمل جادہ حق کے متلاشی مردان خدا کو نمونہ عمل فراہم کرتا۔ یہ لوگ جب تلاوت کرتے تو راہ چلتے لوگ رک جاتے اور ان پر ایسا اثر ہوتا کہ وہ کتاب ہدایت کے حقائق و معارف جاننے کے لئے بے تاب ہو جاتے۔ الغرض حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ روحانی سفیر جس علاقے میں گئے فتوحات نے آگے بڑھ کر انکا استقبال کیا اور ساری اسلامی دنیا فیضان غوثیہ سے معمور ہو گئی۔ آپ کے تجدیدی کام نے بالعموم ساری دنیا اور بالخصوص بلاد اسلامیہ میں نظریاتی انقلاب برپا کر دیا اور حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث پاک کا علمی نمونہ بن گئے جس میں ہر صدی کے سرے پر مجدد کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی تھی۔ ان روحانی اور علمی فتوحات کے ساتھ ساتھ آپ کے شاگرد اور عقیدت مند سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر، شام اور بیت المقدس میں شاندار فتوحات کے بعد اسلامی سلطنتیں قائم کیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان تھا اس طرح آپ نے ہر میدان میں تجدید دین فرمائی۔

بزرگان دین نے اسلامی معاشرت میں جن چیزوں کو رواج دیا ان کے پیچھے کوئی

خاص تبلیغی مقصد کارفرما ہوتا تھا۔ بزرگان دین کے پیش نظر لوگوں کو کھانا کھلا کر سستی شہرت حاصل کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ کوئی تقریب منعقد کر کے کوئی محفل سجا کر عامۃ الناس کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرتے تھے شریعت و طریقت کے رموز سمجھاتے اور ان میں ایک خاص ذوق پیدا کرتے تھے۔

ہر دور میں اولیاء کرام اپنے اپنے انداز میں تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی طرح اپنے دور میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور نذر و نیاز پیش کرنے کے لئے ایک ماہانہ محفل کو رواج دیا جو ہر اسلامی ماہ کی گیارہ تاریخ کو بڑی شان و شوکت سے انعقاد پذیر ہوتی تھی۔ لوگ دور دور سے چل کر دین سیکھنے کے لئے اس محفل میں حاضر ہوتے۔ حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس محفل میں آنے والے مسلمانوں کی دینی اخلاقی' معاشرتی اور فکری تربیت فرما کر ایسے عظیم لوگوں کی کھیپ تیار کی جنہوں نے مسلمان قوم کو ٹھوس قیادت فراہم کی اور نت نئے فتنوں کا بڑے موثر انداز میں صد باب کیا۔ اس مبارک محفل نے اچھے نتائج کی وجہ سے بڑی شہرت پائی اور اسلامی دنیا میں گیارھویں شریف کے نام سے مشہور ہوئی۔ (فرق النظر صفحہ ۱۱ بحوالہ کتابچہ عیدوں کی عید پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد)

اس پاکیزہ اور مقدس محفل کا تسلسل آج بھی جاری و ساری ہے لیکن افسوس صد افسوس عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آ جانے کے سبب، سارے شرف تقدس کے باوجود رفتہ رفتہ اس کی اصل روح مجروح ہوتی جا رہی ہے۔ پروفیشنل اور بے علم و عمل پیروں کی بھر مار کے باعث گیارھویں شریف محض ایک فیشن بن کر رہ گئی ہے۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ گیارھویں شریف کی محفل میں زرق برق لباس میں ملبوس لوگ بڑے شوق سے آتے ہیں، لنگر کھاتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اگر کہیں کسی عالم دین کے وعظ انتظام بھی ہو تو بد قسمتی سے کچھ لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں ورنہ جمہور کی نظریں لنگر پر ہوتی ہیں اور وہ لنگر کھاتے ہی گیارھویں شریف کی محفل سے "نو دو گیارہ"

حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ

حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ ایشیاء کے وہ مایہ ناز سپوت ہیں۔ جن کی حکمت ایشیاء کی سرحد پار کر کے یورپ کے علمی ایوانوں تک پہنچی اور یورپی دانشوروں نے اس سے خوب خوب استفادہ کیا۔ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ علم تصوف و اخلاق کے ایسے نامور مصلح مانے گئے، جن کے اقوال زریں آج بھی لوگوں کے لئے راہنما اصولوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا نام محمد بن ابوبکر ابراہیم بن اسحاق ہے اور فریدالدین لقب سے آپ زیادہ معروف ہیں، چونکہ آبائی پیشہ عطاری تھا۔ اس لئے عطار کہلاتے تھے۔ ۵۱۳ھ میں نیشاپور کے قصبہ "کدکن" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابوبکر ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ چونکہ مشہور عطار تھے۔ لہٰذا حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی عمر میں اسی عطار کی دکان پر کام کیا۔ اسی دوران والد صاحب سے طب بھی پڑھی اور بحیثیت ایک طبیب خدمت خلق کرنے لگے۔ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا بہت بڑا دواخانہ تھا اور اس میں کئی سو مریض یومیہ دیکھتے تھے۔ اپنے اس شغل کے دوران بھی آپ تصوف کی طرف متوجہ رہے۔

ایک روز حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ اچانک ایک فقیر آیا اور اس نے کہا کہ خدا کے نام پر کچھ دو۔ آپ نے توجہ نہ دی۔ فقیر نے کہا آپ دنیا داری میں اتنے مصروف ہیں تو اللہ کو جان کیسے دیں گے۔ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جس طرح آپ جان دیں گے میں بھی دے دوں گا۔ فقیر جوش میں آ گیا۔ آپ کی دوکان کے سامنے اپنا کشکول سرہانے رکھ کر لیٹ گیا اور کلمہ پڑھتے ہوئے جان دے دی۔

جب آپ نے یہ صورت حال دیکھی تو آپ کے دل و دماغ پر اتنا شدید اثر ہوا کہ اپنی ساری دولت راہ خدا میں لٹا کر تارک الدنیا ہو کر سلوک کی منزلیں طے کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فریدالدین عطار کو شیخ مجد الدین بغدادی خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں شمار کیا ہے۔ حضرت شیخ مجد الدین رحمۃ اللہ علیہ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلیفہ ہیں۔

حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہر دور میں تالیف و تصنیف کو اپنا شیوہ بنائے رکھے، چنانچہ مشہور ہے کہ مثنویوں کے علاوہ آپ نے تقریباً چالیس ہزار اشعار کہے ہیں اور آپ کی جملہ تصانیف ۱۱۳ ہیں۔ اسرار نامہ، الٰہی نامہ، جواہرالذات، وصیت نامہ، بلبل نامہ، حیدرنامہ، شترنامہ، مختارنامہ، شاہنامہ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتابیں ہیں، اور منطق الطیر تو آپ کی وہ شہرۂ آفاق کتاب ہے جو دنیا بھر کے تمام علماء و مشائخ اور غیر مسلم سکالرز بھی اپنے مطالعہ میں رکھتے ہیں۔

تصوف میں حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے بزرگ بھی اپنے آپ کو ان کا پیروکار قرار دیتے ہیں۔ حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ عشق کے سات بازار ہیں۔ میں نے ایک کی سیر کی ہے اور حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے ساتوں کی سیر کر رکھی ہے۔

واقعہ شہادت:

۶۲۷ھ میں آپ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، تاتاریوں کے عین ہنگامے میں ایک سپاہی نے حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کیا ایک راہ گیر نے بڑھ کر کہا دیکھنا حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو قتل نہ کر دینا، میں دس ہزار اشرفیاں نقد دیتا ہوں کہ ان کو چھوڑ دو۔ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خبردار اتنے پر مجھے فروخت نہ کر دینا۔ میری اس سے کہیں زیادہ قیمت ہے۔

سپاہی خوش ہوا کہ اس سے بھی زیادہ دولت ہاتھ آئے گی اور وہ بھی بالکل مفت، آگے بڑھ گیا۔ آگے ایک اور شخص ملا اس نے سپاہی سے کہا کہ اس بوڑھے کو مجھے دے ڈالو میں ایک گٹھا

گھاس کا اس کے معاوضے میں دیتا ہوں۔ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ بولے ہاں دے ڈال کہ میری قیمت اس سے بھی کم ہے۔ سپاہی کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ دس ہزار اشرفیاں ملتی ہوئی ہاتھ سے گئیں جھلا کر آپ کو قتل کر ڈالا۔ جب اس سپاہی کو حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی کا علم ہوا تو اپنی خطا پر نادم ہوا اور مسلمان ہو کر انہیں کے مزار کا مجاور بن گیا۔ شیخ عطار کا مقبرہ نیشاپور میں آج تک عوام و خواص کا مرجع بنا ہوا۔

اے فرید الدین تو ہے معرفت کا
خوب تجھ پہ کھل کر برسی رحمت پروردگار
اے فرید الدین تیری چار سو شہرت ہوئی
رحمت للعالمین کی تجھ پہ بھی شفقت ہوئی
اے فریدالدین تو ہے قوم کا مایۂ ناز
اے فریدالدین تو ہے راز و نیاز
اے فریدالدین رومی تیرے پیروکار ہیں
اے فریدالدین جامی عشق میں سرشار ہیں
اے فریدالدین تو اسلام کا وقار ہے
مشرق و مغرب میں تیرے علم کا پرچار ہے
اے فریدالدین تیرے پیر حضرت مجدُالدین
کون مجدُالدین وہ جو ہیں مرید نجم الدین

☆☆☆☆

شاہ نگار

سلطان صلاح الدین ایوبی کا بہادر بیٹا

سلطان صلاح الدین ایوبی مصر وشام کے بعد فلسطین پر بھی اپنا پھریرا لہرا چکا تھا اور "فاتح بیت المقدس" ہونے کے ناطے وہ اسلامی دنیا کا ہیرو بن چکا تھا۔ گو کہ یہ ساری فتوحات اس نے اپنے زور بازو سے حاصل کیں تھیں۔ لیکن وہ پھر بھی بغداد کی خلافت عباسیہ کے تحت ہی رہا حالانکہ اس وقت اسلامی دنیا میں اس کی حیثیت ایسی تھی کہ وہ اگر چاہتا تو اپنا سکہ چلا سکتا تھا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوا سکتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ ایک مجاہد ہونے پر فخر کرتا رہا۔

اس کی یہ شرافت وانکساری ہی تھی۔ جس نے عباسی خلیفہ ناصر الدین احمد کے دل میں اس کا وقار بہت بڑھا دیا تھا اور عباسی خلیفہ نے بغداد میں بیت المقدس کی فتح کا جشن منایا اور ایک چاندی کا چاند تارہ بنوا کر صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں بھیجا کہ اسے خلیفہ بغداد کی طرف سے مسجد اقصیٰ کے برج پر نصب کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ایک تعریفی خط بھی ارسال کیا۔ جس میں بیت المقدس کی فتح پر مبارکباد پیش کی گئی تھی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے جانثار ساتھیوں کے جذبہ جہاد کی دل کھول کر تعریف کی گئی تھی اور مسلمانوں کے نام پیغام تحریر تھا کہ حضرت خالد بن ولید "سیف اللہ" تھے۔ اور سلطان "سیف الجہاد" ہیں۔ مسلمانو یہ تلوار کبھی ہاتھ سے نہ رکھنا اس میں تمہاری شوکت وسطوت کا راز پوشیدہ ہے۔

سلطان کی عادت تھی کہ مفتوحہ شہروں میں جمعہ کے روز داخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بیت المقدس فتح ہو جانے کے بعد بھی سلطان اپنے فوجی کیمپ میں مقیم جمعہ کا انتظار کر رہا تھا اور یہ جمعہ تو غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ کہ حضور سرور دو عالم ﷺ کے معراج شریف کا مذہبی تہوار بھی

جمعہ کے روز آ رہا ہے اس لئے سلطان کا پروگرام یہ تھا کہ جمعہ کے روز شہر میں داخل ہو تا کہ جمعہ اور معراج شریف کی دوہری رحمتیں ہمارے شامل حال ہوں لیکن خلیفہ بغداد کی خواہش تھی کہ چاندی کا چاند تارا فوراً نصب کر دیا جائے۔ لہٰذا سلطان نے اپنے منجھلے بیٹے ملک الظاہر غیاث الدین مظفر کو خلیفہ بغداد کی خواہش پوری کرنے کے لئے بھیج دیا۔

شہزادہ ظاہر بیت المقدس پہنچا تو گلیوں سے گزرتے ہوئے شہزادہ کو دیکھنے کے شوق میں رآئی دروازوں کے پٹ نیم وا ہو گئے اور چھتوں پر رنگین آنچل لہرانے لگے شہزادہ رنگ بدلتی رتوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا اپنی منزل پر پہنچا حسام الدین عمر، قاضی محی الدین خطیب اور سپہ سالار عماد الدین زندگی کے نائب عز الدین نے شہزادہ کا استقبال کیا۔ شہزادہ کمال احترام وعقیدت سے مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا یہ بدھ کا روز تھا اور سلطان کے شہر میں داخل ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ مسجد اقصیٰ کی بحالی کا کام زور شور سے جاری تھا۔ عیسائیوں کی یادگار حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت بی بی مریم علیہا السلام کی مورتیاں اور صلیب کے نمونے ہٹا دیئے گئے تھے اور در ودیوار پر بنی ہوئی تصویریں کھرچی اور مٹائی جا رہی تھیں۔ جو اسلام کے لئے کسی طرح قابل قبول نہیں تھیں۔

شہزادہ نے محی الدین خطیب کے ہاتھوں "ستارہ چاند" نصب کرایا اور دعائے خیر پر یہ تقریب ختم ہوئی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر شہزادہ اور اس کے ساتھ مجاہدوں نے واپسی کی راہ لی، شہر سے گزرتے ہوئے جب شہزادے کی سواری اس مکان کے سامنے سے گزرے جہاں عیسائی تسلط کے دور میں ان کا بڑا پادری رہائش پذیر تھا تو اس مکان میں سے ایک عورت کے چلانے کی آواز سن کر شہزادے نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور اپنے ایک ماتحت سے کہا کہ پتا کرو۔ اس مکان میں کسی مظلوم عورت پر ظلم تو نہیں ہو رہا۔ چھاپہ مارنے پر پتا چلا کہ بڑے پادری صاحب جوزف نامی جس نوجوان پادری کو اپنا نائب بنا کر خود یورپ بھاگ گئے تھے وہ کلیسا کی ایک کنواری راہبہ کو

دیوچے ہوئے اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہا تھا۔

دوسرے دن یہ مقدمہ سلطان کی بارگاہ میں پیش ہونا تھا۔ جوزف پادری نے شہزادے کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا کہ مجھے ایک رات عبادت کرنے کی مہلت دے دیں۔ میں یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا نیک دل شہزادے نے پادری کی درخواست قبول کر لی وہ پادری جوزف کمرے میں چلا گیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ دوسری صبح جب دن چڑھے تک جوزف کا کمرہ نہ کھلا تو مسلمان سپاہی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اندر جا کر دیکھا تو جوزف خودکشی کر چکا تھا اور اس کی نعش آج اسی جگہ لٹک رہی تھی جس جگہ وہ کل ایک کنواری راہبہ کے سامنے رنگ رلیاں منا رہا تھا۔

جوزف ساتھی پادری اور راہبہ کو دوسرے دن سلطان کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ اور راہبہ رو رو کر کہنے لگی اے عادل بادشاہ مجھے رہبانیت سے چھٹکارا دلایا جائے لیکن اس کا ساتھی پادری مُصر تھا۔ کہ ”جو راہبہ بن جائے وہ کبھی بھی اس راستہ کو چھوڑ نہیں سکتی“۔ راہبہ بھی جانتی تھی۔ کہ اس بارے میں کلیسا کے قوانین بہت سخت ہیں۔ جس کنواری لڑکی کے والدین اسے کلیسا کے حوالے کر دیں۔ وہ راہبہ بن کر ساری عمر بِتانے کی پابند ہو جاتی ہے لیکن راہبہ نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس راہبہ کو اپنی بیٹی بنا لیا اور وہ شاہی محل میں شہزادیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگی۔

اسلام فطری دین ہے اور رہبانیت کے مخالف ہے جو لوگ تحقیق کے شغف رکھتے ہیں چاہے تو کسی بھی مذہب کے ہوں اسلام کو بطور دین فطرت خوب سمجھتے ہیں۔ تلاش حق کی راہ میں راہبہ بننے والی آخر ایک دن تلاش حق میں کامیاب ہو گئی جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا تو وہاں کے بڑے پادری ہرکولیس نے کلیسا کی ساری دولت سمیٹ کر یورپ کی طرف روانہ ہونے کی کوشش کی تو مسلمان پہرہ داروں نے اسے روک لیا معاملہ جب سلطان کی عدالت میں پہنچا تو سلطان نے پوچھا کلیسا کی دولت کا قانونی وارث کون ہوتا ہے تو ہرکولیس کے نمائندے پادری جوزف نے کہا کے بڑے پادری صاحب ہی کلیسا کی دولت کے وارث ہیں۔

دربار میں موجود ایک مشیر عماد الدین الکاتب گویا ہوا۔ سلطان معظم یہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ کلیسا کی دولت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ قوم کی امانت ہوتی ہے پھر اپنے دعویٰ کے حق میں دلیل کے طور پر جب عیسائی مذہب کی کتاب کا حوالہ دیا تو پادری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا لیکن سلطان نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ جب بیت المقدس کے عیسائیوں کو کوئی اعتراض نہیں تو ہم پادری بھی نہیں روکتے پھر سلطان نے ایک پروانہ عطا کیا اور پادری اپنے مختصر سے قافلے کو لے کر یروشلم سے بحیرہ روم کے ساحلی شہر ”صور“ کی طرف چل پڑا۔ قافلے نے ابھی تھوڑا ہی سفر طے کیا تھا کہ رات پڑ گئی اب ان کے پاس دو راستے تھے ایک شہری گزرگاہ جو مسلمانوں کے شہر ”رملہ“ سے ہو کر گزرتی۔ (شہر جہاں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک عادل کی حکومت تھی) اور دوسرا خطرناک پہاڑی راستہ تھا لیکن چونکہ پادری کے دماغ پر مسلمانوں کا رعب تھا اس لئے اس نے پہاڑی راستے کا انتخاب کیا ابھی گھوڑے بڑھائے ہی تھے کہ 20 سواروں کے ایک فوجی دستے نے ان کا راستہ روک لیا۔ پادری نے فوراً سلطان کا عطا کردہ پروانہ ہوا میں لہرایا سوار دستہ کے نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر پوچھا کیا آپ یروشلم کے پادری ہیں ہرکولیس نے اثبات میں سر ہلایا اور سلطان کا عطا کردہ پروانہ آگے بڑھاتا ہوا بولا ہمیں سلطان نے یہ پروانہ عطا کیا ہے اور ہم ”صور“ کی طرف جا رہے ہیں نوجوان افسر نے کہا ہمیں معلوم ہے اور ہم آپ ہی کی حفاظت کے لئے کھڑے ہیں ملک العادل کا حکم ہے کہ آپ کو اس خطرناک راستے سے باحفاظت نکال دیا جائے۔ پادری بولا ہم پہلی منزل سلفط شہر میں کرنا چاہتے ہیں نوجوان افسر نے کہا جیسے آپ کی مرضی میں آپ کو سلفط تک چھوڑ آتا ہوں پادری حیرت سے منہ تکنے لگا اور بولا اے نوجوان آپ کا بہت بہت شکریہ۔ سلفط یہاں سے کافی دور ہے اور ممکن ہے کہ اس کے سفر میں ساری رات لگ جائے نوجوان افسر نے پُرجوش انداز میں کہا کہ مجھے ہر حال میں اپنا فرض نبھانا ہے جو ملک عادل نے مجھے سونپا ہے۔ پادری بولا ہم تو چاہتے تھے کہ آپ زحمت نہ کریں لیکن آپ ضد کرتے ہیں تو چلیں اور ساتھ ہی سب قافلے والوں کے نوجوان افسر کے اشارے پر اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ

لیں اور رملہ شہر والی گزرگاہ سے وہ سلفط کی جانب بڑھنے لگے رات کے تیسرے پہر وہ سلفط پہنچے، فصیل پر کھڑے پہرہ داروں نے نوجوان افسر کو سلام کیا اور قافلہ شہر میں داخل ہو گیا۔

پادری بولا ہم تو کلیسا میں آرام کریں گے۔ آپ تو غالباً قلعہ میں آرام فرمائیں گے۔

نوجوان افسر نے کہا سپاہی کبھی آرام نہیں کرتے ہم فوراً واپس رملہ جائیں گے۔ تمام قافلے والے حیران تھے کہ یہ مسلمان کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ محض اپنے دشمنوں کو بحفاظت جنگل پار کرانے کے لئے رات بھر محوِ سفر رہے اور اب آرام کئے بغیر واپس ہوا چاہتے ہیں۔ پادری بھی اس جفاکشی اور ہمت مردانہ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وقت رخصت نوجوان افسر نے اپنی انگوٹھی اتار کر پادری کو دیتے ہوئے کہا کہ جس راستے سے آپ جا رہے ہیں اس راستے میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بڑے بیٹے ''الملک الافضل نورالدین'' کی فوجیں آ رہی ہیں وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں تو آپ میری یہ انگوٹھی دکھا کر اُن سے پناہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس پادری نے جب انگوٹھی دیکھی تو اس پر لکھا تھا ''الملک الظاہر غیاث الدین'' پادری حیرت کے مارے گھوم سا گیا اور پوچھا کیا آپ بھی سلطان کے فرزند ہیں۔ نوجوان نے کہا جی میں بھی سلطان عالی کا بیٹا ہوں لیکن میں اپنے آپ کو شہزادہ نہیں ایک سپاہی سمجھ کر خدمات انجام دیتا ہوں پادری دل ہی دل میں کہہ رہا تھا مسلمانوں کا یہی ایثار اور خلوص ہے جو ہر میدان میں انہیں فتح سے ہمکنار کرتا ہے۔

بزرگانِ دین کا نعتیہ کلام

مرتبہ: صلاح الدین سعیدی

تیسرا، چوتھا، پانچواں حصہ

منتظرِ طبع ہے

بیبیاں پاکدامن! تاریخ و تحقیق

حضرت شیخ شہر اللہ بن شیخ رحمت اللہ ''تذکرہ حمیدیہ'' میں لکھتے ہیں۔

''حضرت پیران پیر سید عبدالقادر جیلانی کے دادا پیر حضرت ابراہیم ابوالحسن بنکاری کی اولاد میں سے شیخ ابوالعلیٰ ''سیستان'' سے ''کیچ مکران'' میں آئے اور اہل کیچ مکران نے آپ کو اپنا سلطان منتخب کر لیا''۔

اُن کے بعد ان کے بیٹے سلطان رشید الدین فرمانروا ہوئے۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے سلطان قطب الدین کے عہد میں ''ترمذ'' سے حضرت سید احمد توختہ ترمذی بمعہ اہل و عیال ''کیچ مکران'' تشریف لائے اور سلطان قطب الدین کے بیٹے شہزادہ بہاء الدین کی شرافت و نجابت کے گرویدہ ہو کر اپنی بیٹی بی بی حاج کا نکاح ان سے کر دیا۔

ان کے بطن سے تین بیٹے ہوئے۔ شہزادہ جمال الدین۔ شہزادہ ضیاء الدین۔ شہزادہ حمید الدین حاکم۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت سید احمد توختہ ترمذی رونق افروز لاہور ہوئے۔ ادھر ان کے داماد بہاء الدین، بادشاہت اپنے بھائی شہاب الدین ابوالبقا کے سپرد کر کے اپنے بیٹوں جمال الدین و ضیاء الدین کے ہمراہ مکہ شریف گئے اور واپسی میں یمن میں انتقال کر گئے۔

اس کے بعد شہاب الدین ابوالبقا نے 2 سال حکومت کرنے کے بعد تخت و تاج اپنے بھتیجے یعنی بہاء الدین مرحوم کے بیٹے شہزادہ حمید الدین حاکم کے سپرد کر دیئے۔

شہزادہ حمید الدین حاکم نے چند سال بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی اور پھر بادشاہی چھوڑ دی اور اپنے چچا زاد بھائی امیر تلبہ کو بادشاہی بخش کر فقیرانہ لباس زیب تن کر کے اپنے نانا جان حضرت سید احمد توختہ ترمذی کی خدمت میں لاہور حاضر ہوئے اور مجاہدہ و ریاضت سے صفائے باطن حاصل کی سید احمد توختہ ترمذی اپنے نواسے حمید الدین حاکم ہی کی موجودگی میں واصل حق ہوئے اور حمید الدین حاکم نے ہی آپ کو چلہ بیبیاں میں دفنایا (جو بیبیاں پاکدامن کی

چلہ کشی کے باعث "محلہ چلہ بیبیاں" کے نام سے مشہور ہے اور اکبری گیٹ کے اندر واقع ہے)۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور کی مطبوعہ "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" کی پانچویں جلد کے صفحہ 361 پر ہے قبرستان پاک دامن بیبیاں (بی بی پاکدامناں) لاہور کے مزارات و مقابر میں زمانہ دراز سے مشہور و متبرک چلا آتا ہے لیکن تاریخی طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ اس قبرستان کا آغاز کب ہوا۔ حدیقۃ الاولیاء کے مصنف نے تذکرہ حمیدیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک عابد، زاہد بزرگ سید احمد توختہ ترمذی (متوفی 602ھ) لاہور آکر قیام پذیر ہوئے۔

ان کی چھ بیٹیاں تھیں۔ ۱۔حاج ۲۔تاج ۳۔نور ۴۔حور ۵۔گوہر ۶۔شہباز۔ یہ سب عابدہ وزاہدہ تھیں اپنے والد (سید احمد توختہ ترمذی) جن کا مزار محلہ "چلہ بیبیاں" اندرون اکبری گیٹ لاہور میں موجود ہے کی وفات کے بعد یہ صاحبزادیاں فصیل سے گھرے ہوئے لاہور کو چھوڑ کر اس علاقے میں قیام پذیر ہو گئیں جہاں اب یہ قبرستان ہے۔

یہ سب بیبیاں اس جگہ مدفون ہیں اور ان کے مزار دو احاطوں میں ہیں۔ پہلے احاطے میں بی بی حاج بی بی تاج بی بی نور کی قبریں ہیں اور دوسرے احاطے میں بی بی حور بی بی گوہر اور بی بی شہباز کی۔ یہ سب قبریں پختہ چونا گچ سے بنی ہوئی ہیں۔ پہلے احاطے میں ایک مقبرہ گنبددار بنا ہوا ہے۔ جس کا سن تعمیر 1016ھ ہے جو میراں محمد شاہ موج دریا بخاری (1013ھ) کے بھائی سید جلال الدین حیدر بخاری کا ہے۔ عبداللہ یا محمد جمال المعروف بابا خاکی کی اولاد ان خواتین کے مزارات کی مجاور ہے۔ ان مزارات کے ساتھ سلاطین وقت نے کچھ اراضی وقف کر دی تھی۔

گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور کے پروفیسر محمد شجاع الدین، ایک تاریخی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ "سلطان قطب الدین ایبک کے دور میں ایک قاضی زاہد اور شب زندہ دار عابد لاہور میں اقامت گزین تھے آپ کا نام سید احمد توختہ ترمذی تھا آپ کی خانقاہ میں سالکان راہ تصوف روحانی منازل طے کرنے کے لئے دور دراز سے آیا کرتے تھے۔ بیبیاں پاکدامن صحیح روایت کے مطابق آپ ہی کی صاحبزادیاں تھیں جن کے مزارات ایمپرس روڈ لاہور کے ساتھ زیارت گاہ انام ہیں"۔

لاہور کے مشہور ہندو مؤرخ رائے بہادر کنہیا لال اپنی کتاب "تاریخ لاہور" مطبوعہ نور یہ پریس لاہور میں لکھتے ہیں۔ "چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک شخص سید، خدا پرست، عابد و زاہد، ولی اللہ سید احمد توختہ ترمذی نامی لاہور میں آکر قیام پذیر ہوا۔ اس کے گھر میں 6 لڑکیاں تھیں حاج۔تاج۔نور۔حور۔گوہر۔شہباز۔ وہ تارک الدنیا، مجرد، عابدہ وزاہدہ تھیں 602ھ میں سید مر گیا لاہور کے اندر محلہ "چلہ بیبیاں" میں مدفون ہوا (اس کی قبر اب تک موجود ہے۔ پہلے اس کی قبر پر مقبرہ تھا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا سنگ مرمر اتروایا تو مقبرہ گر گیا۔ اس کے گرد و نواح کے قبرستان کو مسمار کر کے غلام محی الدین شاہ پیرزادہ رہتہ نے اپنی حویلی بنائی اور وہ قبر اب ایک طویلے کے اندر پختہ بنی ہوئی ہے) اس کے مرنے کے بعد اس کی لڑکیاں لاہور کے حصار سے باہر جا کر قیام پذیر ہوئیں۔ اور لوگوں سے الگ یہ عبادت حق مصروف ہوئیں۔ آخر جب 615ھ میں کفار مغل (یعنی چنگیز خاں) نے بہ تعاقب سلطان جلال الدین خوارزمی کے پنجاب پر لشکر کشی کی اور لاہور در عایا بہ جرم مقابلہ و مجادلہ قتل ہوئی تو یہ بیبیاں کہ مستورہ اور مخدرہ تھیں، نہایت گھبرائیں کہ اب نامحرم لوگ آ کر ہم کو بے پردہ کریں گے اور سب نے مل کر دست دعا خدا کے حضور اٹھائے اور کہا کہ یاالٰہی ہم کو زمین کا پیوند کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا زمین جابجا سے پھٹ گئی اور وہ چھیوں بیبیاں مع اپنی خادمہ عورت بی بی تنوری وغیرہ کے زمین میں سما گئیں اور ان کی اوڑھنیوں کے پلے ذرا ذرا زمین سے باہر رہ گئے جن پر بعد امن و چین لوگوں نے قبریں بنا دیں"

"تذکرہ علمائے لاہور" مطبوعہ 1920 کے مصنف منشی محمد دین فوق لکھتے ہیں۔

"یہ بیبیاں حضرت سید احمد توختہ ترمذی کی صاحبزادیاں تھیں جو چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اپنے وطن "کرمان" آئے اور پھر لاہور آئے اور یہیں انکا انتقال ہوا۔ اُن کی بیٹیاں بڑی عابدہ و زاہدہ اور علم دین میں کمال درجہ رکھتی تھیں۔ 614ھ میں چنگیز خانی لشکر جلال الدین خوارزمی کے تعاقب میں تاخر کرتا ہوا لاہور پہنچا تو اسے بھی تاراج کیا۔ بیبیوں نے خدا کی درگاہ میں التجا کی کہ ہمیں نامحرموں کی دست برد سے محفوظ رکھ چنانچہ زمین نے انہیں اپنے اندر چھپا لیا"۔

مشہور ماہر انساب، مورخ اور محقق پیر غلام دستگیر نامی اپنے رسالے "بیبیاں پاکدامن کے نسب اور لاہور آمد کی تحقیق" مطبوعہ نومبر 1935 میں رقمطراز ہیں۔

"شہر لاہور کے جنوب مشرق کی طرف قلعہ گوجر سنگھ اور ایمپرس روڈ کے مشرق کی جانب ایک مشہور مزار بنام "خانقاہ بیبیاں پاکدامن" واقع ہے جن بیبیوں کے یہاں مزارات ہیں وہ معتبر تاریخی نوشتوں کے مطابق حضرت سیّد احمد توختہ ترمذی کی صاحبزادیاں ہیں سید صاحب کا مزار اندرون اکبری دروازہ چوک نواب صاحب کے ساتھ محلہ "چلہ بیبیاں" میں ہے (یہ چلہ خانہ انہیں بیبیاں پاکدامن کا ہے)۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کے بعد اس کے بہادر بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ نے 1230ء میں باپ کی پگڑی اور تلوار زیب تن کی اور چنگیزی ترکوں سے یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کا رُخ کیا۔ دریائے سندھ کے کنارے اس کا کثیر التعداد غنیم سے مقابلہ ہوا۔ صبح سے شام تک وہ بڑی مردانگی سے لڑتا رہا جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنی قلیل جماعت کے ساتھ مقابلے میں پورا نہیں اتر سکتا تو اُس نے ایک نہایت بے جگرانہ حملہ کیا اور زرہ وغیرہ پھینک کر دریا میں گھوڑا ڈال دیا ہمراہیوں نے بھی اس کی متابعت کی۔ کئی ڈوبے اور کئی دشمن کے تیروں کی نذر ہوگئے مگر وہ پار اترنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور لڑتا بھڑتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں لاہور پر قابض ہوگیا۔ اس کے تعاقب میں چنگیز خان کا جرنیل "ترتائی" کئی ہزار سوار لے کر لاہور پہنچا اور اسے تاخت وتاراج کردیا۔ اس فوج کے چلے جانے کے بعد جلال الدین خوارزم ایران کی طرف لوٹا اور اپنے باپ کی عظیم الشان سلطنت کا بہت سا حصہ واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر 1231ء میں اس کی قسمت پھر زوال پذیر ہوگئی اور اسے "کردوں" کے ایک گاؤں میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس کے بعد "خاندان غلاماں" کے بادشاہ مسعود علاء الدین کے عہد میں چنگیزی مغلوں نے پھر حملہ کیا کئی ہزار مسلمان شہید ہوئے اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوگیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ حضرت سیّد احمد ترمذی کی صاحبزادیاں لاہور میں موجود تھیں جب انہوں نے اپنی عزت خطرے میں دیکھی تو خدا سے دعا کر کے پیوند زمین ہوگئیں"۔

قارئین کرام ۲ مستند تاریخ نوشتوں سے بیبیاں پاکدامن کے مختصر حالات زندگی، خاندانی پس منظر اور ان کے عہد کے سیاسی حالات آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

اب بعض ان پڑھ، جاہل، ملنگ، نشئی لوگوں اور عورتوں کی پھیلائی ہوئی من گھڑت

افواہوں کے قلعی کھولنے کے لئے چند منطقی معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آنکھیں کھلی رکھنے والے قارئین قوت فیصلہ کو کام میں لائیں۔

☆ بیبیوں کے نام خود اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ عربی نہیں عجمی نام ہیں خاص طور پر گوہر اور شہباز نام تو آج تک کسی عرب عورت کے سننے میں نہیں آئے۔ اور پھر نام کے ساتھ لفظ "بی بی" تو عجمی عورتوں کی خاص شناخت ہے۔

☆ عرب اور لاہور میں اُس وقت کسی قسم کے سیاسی، معاشرتی یا تجارتی تعلقات کا نام و نشان تک نہ تھا اور نہ ہی آمد و رفت کے متعین ذرائع تھے۔

☆ تاریخ کی بڑی بڑی کتابوں میں سے کسی کتاب میں یہ بات مذکور نہیں کہ نویں محرم کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ کر کوئی میدان کربلا سے نکلا ہو۔

☆ اکبری گیٹ لاہور کے اندر محلہ "چلہ بیبیاں" بھی اس حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ ہے کہ وہ لاہور ہی میں مقیم تھیں اور "چلہ بیبیاں" اُن کے چلہ کی وجہ سے نام پڑ گیا تھا بعد میں وہ موجودہ مقام پر آگئیں جہاں ان کے مزارات ہیں۔

☆ افواہ سازوں نے ایک بی بی کا نام حضرت رقیہ بنت علی مشہور کر رکھا ہے حالانکہ حضرت سیدہ رقیہ بنت علی رضی اللہ عنہ کا روضہ مبارک شام کے دارالحکومت دمشق میں موجود ہے اور لاکھوں لوگ اپنی آنکھوں سے اس کی زیارت کر رہے ہیں۔ (اگر کسی کو ثبوت درکار ہو تو ہم روضہ مبارک کی تصویر بھی پیش کرسکتے ہیں)

☆ واقعہ کربلا کے وقت یعنی 61ھ میں لاہور میں کوئی مسلمان آبادی نہیں تھا جس کی طرف بیبیاں ہجرت کر کے آتیں۔ لاہور کا ذکر کتابی دنیا میں سب سے پہلے 372ھ میں اس وقت آیا جب ایک عرب سیاح نے اپنی کتاب "حدود العالم" میں لکھا کہ "لہور شہر کے متعدد اضلاع ہیں اور اس کا حاکم امیر ملتان کا نائب ہے اس میں بازار اور بت خانے ہیں اس میں چلغوزہ، بادام اور ناریل کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں یہاں کے لوگ سب بت پرست ہیں ایک بھی مسلمان نہیں"۔

(حدود العالم 372ھ انگریزی ترجمہ منوآسکی مطبوعہ لندن 1937ء صفحہ 89) نوٹ: اگر اتنی عظیم علم خواتین کے یہاں مزارات ہوتے تو حدود العالم کا مصنف ضرور ذکر کرتا)

☆ یہ بھی مشہور کیا جاتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخش یہاں گھٹنوں کے بل چل کر آیا کرتے تھے اور یہاں انہوں نے چلہ بھی کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو ضرور حضرت داتا گنج بخش اپنی کتاب کشف المحجوب میں ان کا ذکر کرتے کیونکہ آپ نے دیگر بزرگوں کا ذکر کیا ہے تو حضرت علی کی بیٹیوں کا ذکر کیوں نہ کرتے۔

☆ اگر کربلا سے اہل بیت کی کسی شہزادی نے نکلنا ہی ہوتا تو مدینہ پاک یا مکہ شریف یا کسی اور عرب علاقہ مثلاً عراق یا شام وغیرہ آسانی سے جاسکتی تھیں کیونکہ ان علاقوں کے باہمی تجارتی و معاشرتی روابط بھی تھے اور ذرائع آمدورفت بھی موجود تھے۔

☆ سب سے بڑی بی بی حاج زوجہ سلطان بہاء الدین والی کیچ مکران کے بیٹے شہزادہ حمید الدین حاکم جو بادشاہی چھوڑ کر فقیر ہوگئے تھے اپنے نانا حضرت سید احمد توختہ ترمذی کے وصال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس پہنچے اور کسب فیض کیا حضرت زکریا ملتانی نے آپ کو اپنی بیٹی فاطمہ کا رشتہ بھی دیا اور اُن کے بطن سے حضرت نورالدین پیدا ہوئے جن کا مزار ''موسبارک''، ضلع رحیم یار خاں میں ہے۔

انہیں پیر نورالدین رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت پیر عبدالعزیز تھے اور حضرت پیر عبدالعزیز کے پوتے حضرت عبدالجلیل بندگی قطب العالم ہیں۔ جن کے حالات زندگی پر کتاب ''تذکرہ قطبیہ'' 1935ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ یہ بزرگ حضرت عبدالجلیل سرکار دو عالم ﷺ کے اشارہ غیبی سے لاہور کے علاقے کوٹ کروڑ (موجودہ میکلوڈ روڈ) تشریف لائے اور ہزاروں لوگوں کو راہ ہدایت دکھائی میکلوڈ روڈ پر آج بھی آپ کی خانقاہ موجود ہے۔ ماہر انساب پیر غلام دستگیر نامی 1935 میں جب حضرت سید احمد توختہ ترمذی کے شجرہ پر تحقیق کی تو اس وقت بی بی پاکدامن سیدہ حاج کی اولاد میں سید منور شاہ اور سید اظہر حسن زاہد بی اے مدیر روزنامہ زمیندار لاہور میں موجود تھے اور انہیں کے شجرہ سے حضرت نامی نے مدد لی تھی۔

آج بھی یقیناً ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ ضرور موجود ہوں گے۔ اتنے روشن دلائل کے باوجود اگر کوئی نہ مانے تو اُسے ''میں نہ مانوں'' کا وظیفہ مبارک۔

حضرت نظام الدین اولیاء اور اصلاح معاشرہ

سلسلہ عالیہ نظامیہ چشتیہ کے بانی اور شیخ اسلام والمسلمین حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاح معاشرہ کے ضمن میں جو عالی قدر خدمات انجام دیں۔ وہ ہماری خانقاہی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ آج کی نشست میں ہم اُس دور کی بگڑی ہوئی صورت حال اور اُس ماحول میں آپ کی انقلابی جدوجہد کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

جس وقت آپ پاکپتن شریف سے خرقہ خلافت لیکر دہلی آئے تو اُس وقت غیاث الدین بلبن تخت دہلی کی رونق تھا۔ جو غالباً 664 ہجری سے حکومت کر رہا تھا۔ یہ بڑا نیک دل حکمران تھا یہی وہ خوش نصیب بادشاہ تھا۔ جو حضرت بابا فرید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتہائی عقیدت مند تھا اور اس نے اپنی شہزادی حضرت بابا فرید کے عقد میں دیکر آپ سے قرابت کا فخر حاصل کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کا قول مشہور ہے کہ ''قیامت کے دن میں اس بات پر فخر کروں گا کہ میں حضرت بابا فرید کا رشتہ دار ہوں''۔

غیاث الدین بلبن حضرت بابا فرید کی نسبت سے آپ کا بھی معتقد تھا اور اس کی حکومت کی بہت سے اہلکار بھی آپ کے مرید تھے۔ غیاث الدین بلبن کا 22 سالہ دور ہندوستان کا اچھا دور شمار ہوتا ہے۔ اہل حکومت کی خوش عقیدگی کا عوام پر بھی گہرا اثر تھا اور معاشرہ میں نیکی اور اصلاح کا عنصر موجود تھا۔

لیکن 686ھ میں بلبن کے انتقال کے بعد جب بلبن کا 17 سالہ پوتا معزالدین کیقباد برسراقتدار آیا تو اس رنگین مزاج نوجوان نے اپنے نیک دل دادا کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ علماء صوفیا کی صحبت ترک کردی چاپلوسی اور خوشامدی وزیروں اور مشیروں نیز عیاش یاروں

دوستوں نے کچی عمر کے اس شہزادے کا مزاج بگاڑ کر رکھ دیا۔ کیقباد نے عیش وطرب کے تقاضے پورے کرنے کیلئے اور نفس امارہ کو تسکین پہنچانے اور سفلی خواہشات کی تکمیل کیلئے دریائے جمنا کے کنارے ایک پرفضا مقام ''کیلوکھڑی'' میں اپنا ایک خاص محل بنوایا اور ملک بھر کی حسینوں اور مہ جبینوں کو وہاں اکٹھا کر لیا۔ جیسے ہی عیاشی کا یہ اڈہ قائم ہوتو دوسرے وزیروں اور مشیروں کے دلوں میں بھی خواہشات نے چٹکیاں لینا شروع کیں اور انہوں نے بھی بادشاہ کے محل کے آس پاس اپنے محلات بنانا شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا قصبہ کیلوکھڑی ایک تماشہ گاہ بن کے رہ گیا اور یہ روش چل پڑی کہ ہر کھاتا پیتا آدمی دہلی چھوڑ کر کیلوکھڑی کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ پھر اس علاقے اور اس کے مخصوص کلچر کی شہرت دہلی کے باہر بھی پھیل گئی اور دوسرے شہروں سے بھی ''شوقین'' یہاں آکر ڈیرے ڈالنے لگے۔

فکر آخرت سے عاری دنیاداروں کی اس سوسائٹی کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستان بھر کے اداکاروں، گلوکاروں، موسیقاروں، طوائفوں اور شراب کے تاجروں کو بھی کیلوکھڑی میں اپنا روشن مستقبل نظر آنے لگا ان رذیل طبقوں نے جوق در جوق کیلوکھڑی کا رخ کیا بس پھر کیا تھا شراب مہنگی ہوگی حسینوں کے نخروں میں اضافہ ہوتا گیا۔ دلالوں کے وارے نیارے ہوگئے۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہو کر رہ گئیں خانقاہیں ویران نظر آنے لگیں۔ تعلیمی ادارے تباہ ہوگئے اشراف کی مہذب محفلیں اجڑ گئیں وضع دار لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے خاندانی لوگ ایک دوسرے سے منہ چھپاتے تھے اور ہر طرف نیچ اور کمین قسم کے لوگوں کی رونمائی تھی۔

ایسے میں ایک دن حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کو غیبی اشارہ ہوا کہ ''یہ کون سی بہادری ہے کہ گوشہ نشین ہو گئے ہو حوصلے کی بات تو یہ ہے کہ معاشرے میں رہ کر یاد الٰہی کرو تا کہ لوگو ں کی بھی اصلاح ہو''

یہ اشارہ پاتے ہی حضرت میدان عمل میں نکلے آج کے ماحول میں شاید ہم اندازہ نہ کر پائیں کہ اُس ''شاہی محلّہ'' کو ختم کرنے کے لیے آپ نے دن رات کتنی محنت کی اور کتنی صبر آزما تکلیفیں اٹھائیں۔

690 میں آپ نے بھی دریائے جمنا کنارے ''غیاث پور'' نامی قصبہ میں اپنا مرکز قائم یا اور سب سے پہلا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ ہر خاص عام کو گناہوں سے تائب ہونے اور بیعت نے کی دعوت دی اس سے قبل مشائخ طریقت نے بیعت کے لیے بڑی کڑی شرائط رکھی ہوتی میں اور مخصوص تارک دنیا صوفی اور درویش ہی اس راہ پر چلنے کی ہمت کر پاتے تھے۔ اس کے کس حضرت نے عام بیعت لینا شروع کر دی جس سے گناہوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں بھی توبہ اور بیعت کا شوق پیدا ہوگیا۔ جب بھی کسی علاقے کا کوئی عیاش آدمی آپ کے آستانہ پر کر توبہ کرتا اور آپ اُس پر ظاہری و باطنی توجہ فرما کر۔ اس کے دل کی دنیا بدل دیتے تو وہ سابقہ ناہ آلودہ زندگی سے نہ صرف متنفر ہو جاتا بلکہ دوسروں کے لیے نمونۂ عمل بن جاتا اور جب اس کے اتھی اس کے اندر زبردست تبدیلی دیکھتے تو ان کے بھی دل کھنچ جاتے اور اس طرح دیے سے دیا تا چلا جاتا۔

حضرت خود اپنی وعظ کی محفلوں میں فرماتے تھے کہ ''میرا تجربہ ہے کہ ہمارے مشائخ کی یعت کے بعد بُرے سے بُرے آدمی میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور دیکھنے میں آتی ہے اور کبھی کبھی مزاحیہ انداز میں فرمایا کرتے کہ میں نے یہ دولت آسانی سے حاصل کی ہے۔ لہٰذا اس لیے آسانی سے لوگوں میں بانٹ رہا ہوں۔ اور کبھی انکساری سے فرماتے ''میاں میں اس لیے ہر آدمی کو بیعت کر لیتا ہوں شاید کسی کے صدقے میری بخشش ہو جائے'' آپ کے اس طرح کے ارشادات سے وگوں کے حوصلے بلند ہوتے اور وہ شریعت کی پابندی میں دل و جان سے لگ جاتے اور ان کے دوں میں بے پناہ رقت پیدا ہوتی جو ان کے ظاہر وہ باطن میں انقلاب پیدا کر دیتی بعض اوقات آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ کس کی تقدیر بدل دیتا بعض اوقات آپ کے مریدوں کو دیکھ کر ں لوگ گندے ماحول سے نکل کر نیکی اور پاکیزگی کی راہ کے راہی بن جاتے۔

حضرت کی محفل میں روحانیت اور نورانیت کا یہ عالم ہوتا کہ جو بھی آتا وہ آپ کے رنگ میں رنگا جاتا بڑے بڑے فاسق و فاجر لوگ خود بخود اقبال جرم کرتے اور توبہ کر کے آپ کے دامن میں پناہ لیتے اور روحانی سکون کی دولت پاتے۔ شہری، دیہاتی، کسان، مزدور، عالم، جاہل، شریف

، بدمعاش، چور، ڈاکو، افسر، طالب علم، امیر، غریب، غرض معاشرے کا ہر فرد آپ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا اور جو آپ کے دربار گہر بار میں آجاتا وہ ناکام ونامراد واپس نہ لوٹتا۔

رفتہ رفتہ آپ کی شہرت امراء کے دربار تک پہنچی اور اکثر درباری امراء ورؤسا اور سرکاری اہلکار بھی اپنی سابقہ زندگی سے متنفر ہو کر نیکی کی راہ پر گامزن ہوئے اور آپ کے دامن سے وابستہ ہو کر روحانی دنیا سے آشنا ہو گئے۔

آپ کا اثر ورسوخ دن بدن بڑھتا جاتا تھا اور دنیادار لوگ آپ کی مقبولیت سے خائف رہتے تھے۔ کیقباد تو اپنی گمراہی کے سبب حضرت کے فیضان نظر سے محروم ہی رہا۔ البتہ اس کی حکومت کے کئی عہدیدار اس حد تک حضرت سے فیضیاب ہوئے کہ اشراق وچاشت اور تہجد کے پابند ہو گئے الغرض آپ نے تمام تر خلوص ومحبت کے ساتھ ایسے انداز میں اصلاح احوال کا نازک کام انجام دیا کہ ایک عام آدمی سے لیکر حاکم وقت تک آپ کے فیضان سے اپنا حصہ لیتے رہے کیقباد کے بعد 690 میں خلجی خاندان تخت دہلی کا وارث ہوا۔ فیروز شاہ خلجی ابراہیم خلجی اور علاؤالدین خلجی آپ کے بڑے معتقد تھے اور علاءالدین کے 2 بیٹے خضر خان اور شادی خان تو آپکے بڑے پکے سچے اور مخلص مرید تھے اور راہ طریقت میں بڑا مقام رکھتے تھے۔

1969ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور نے ضیا الدین برنی کی فارسی کتاب تاریخ فیروز شاہی کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ جس کے صفحہ نمبر 500 پر مترجم ڈاکٹر سید معین الحق نے اس سنہری دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

اگر حضرت کے مریدوں میں سے کسی سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی تو اسے جدید بیعت کرنا پڑتی تھی۔ لہٰذا اس شرمساری سے بچنے کے لیے لوگ گناہوں سے اجتناب کرتے تھے۔ اور عبادت کی طرف راغب رہتے تھے۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، نوجوان اور بچے سب نماز پڑھنے لگے تھے۔ آپ کے ارادت مندوں کی اکثریت چاشت اور اشراق تک کی پابندی ہو گئی تھی۔ مخیر حضرات نے شاہراہوں پر لکڑیوں کے چبوترے اور چھپر بنوا دیے تھے اور کنویں کھدوا دیے تھے اور پانی کے گھڑے اور مٹی کے لوٹے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ تاکہ دور دراز سے آنے والے مریدوں کو

سہولتیں پہنچائیں۔ ان چھپروں میں نفل پڑھنے والوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا تھا۔ اور آپس میں اکثر چاشت، اشراق، زوال، اوابین اور تہجد کے مسائل موضوع سخن بنے رہتے تھے اور لوگ ایک دوسرے سے یہی پوچھا کرتے تھے کہ صبح کون سی نماز کا وقت کب شروع ہوتا ہے۔ نمازوں میں کونسی سورتیں پڑھنا افضل ہے۔ کس وقت کتنے درود شریف پڑھنے کی کیا فضیلت ہے۔ نفل کس کس وقت میں افضل اور کب مکروہ ہیں کونسی نفل نماز کی کتنی سے کتنی تک رکعتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

نئے مرید پرانے مریدوں سے معلومات حاصل کرتے اور پرانے مرید شوق سے یہ فریضہ ادا کرتے کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ کسی کی چغلی کھائے۔ غیبت کرے جو حکومتی عہدیدار حضرت کے دست بیعت ہوئے وہ ایام بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزے بڑے بڑے اہتمام سے رکھتے تھے۔ رمضان میں مسجدوں کے علاوہ لوگ اپنے گھروں اور ڈیروں پر بھی تراویح میں ختم قرآن کیا کرتے تھے۔

تاجروں کا اخلاق بلند ہو گیا تھا۔ ذخیرہ اندوزی، کم تولنا، جھوٹ اور دھوکہ دہی قطعی طور پر ختم ہو گئی تھی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب احیاالعلوم اور حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی کشف المحجوب اکثر لوگوں کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ ان کے علاوہ قوت القلوب عوارف المعارف، شرح تعرف، رسالہ قشیریہ، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ اور ایسی ہی دیگر کتابوں کی مانگ میں روز بروز اضافہ ہوتا تھا۔ مصنف کہتے ہیں۔ میں خود ذاتی طور پر کسی ایسے مریدوں کو جانتا ہوں جو حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت کے باعث خود صاحب کشف وکرامات ہو گئے تھے۔

حضرت سید محمد گیسودراز قدس سرہ العزیز

آپ کا اسم شریف سید محمد تھا۔آپ 4 رجب 721 ہجری کو دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کے لقب گیسودراز کا پس منظر بیان کرتے ہوئے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

آپ کے گیسوئے مبارک زانوؤں تک دراز تھے۔ایک روز اپنے پیرومرشد کی پالکی کندھے پر لئے جا رہے تھے کہ آپ کے گیسوئے دراز پالکی کے پائے میں اُلجھ گئے۔جس سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی لیکن ادب کے باعث پالکی کو نہ روکا۔جب پیرومرشد نے آپ کے اس جذبہ عشق واخلاص کو دیکھا تو فرمایا:

ہر کہ مرید "سید گیسودراز" شد

واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

یعنی جو بھی گیسودراز کا مرید ہوگا وہ ضرور عاشق صادق ہوگا۔

بس اسی دن سے آپ گیسودراز مشہور ہوگئے۔آپ کے والد گرامی حضرت سید یوسف حسینی حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید باصفا اور اپنے پیر بھائی چراغ دہلی حضرت نصیرالدین محمود کے فیض یافتہ تھے۔

ابھی آپ سات سال کے تھے کہ حضرت سید یوسف حسینی دہلی سے دولت آباد نقل مکانی کر گئے۔وہیں آپ نے قرآن پاک حفظ کیا اور ابتدائی کتابیں شروع کیں۔15 سال کی عمر تک آپ کا قیام "دولت آباد" میں رہا پھر والد بزرگوار کی رحلت کے بعد والدہ ماجدہ کے ساتھ واپس دہلی آگئے اور حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے۔علوم ظاہری مولانا اشرف الدین کیتھلی مولانا تاج الدین دہلی اور قاضی عبدالمقتدر سے حاصل کئے اور پیرومرشد کی صحبت میں روحانی منازل طے کرتے رہے۔قریب قریب 4 سال میں آپ نے مروجہ نصاب تعلیم مکمل کر لیا اور 20 سال ریاضت ومجاہدہ کیا۔ابتداء میں آپ موسیقی کے ساتھ قوالی سنا کرتے تھے جب پیرومرشد کو خبر ہوئی اور انہوں نے ناراضگی کا اظہار فرمایا تو آپ نے ہمیشہ کے لئے موسیقی کے ساتھ قوالی سننا ترک کر دیا۔

آپ نے 20 برس کے قریب پیرومرشد کی خدمت انجام دی۔آپ آدھی رات کو اٹھ کر وضو کرتے پھر پیرومرشد کو وضو کراتے۔جب پیرومرشد وظائف میں مشغول ہو جاتے تو آپ نماز تہجد ادا کرتے۔اس کے علاوہ پانچوں نمازوں کے وقت آپ پیرومرشد کو وضو کرایا کرتے تھے۔آپ کے شیخ نے کس طرح آپ کی تربیت فرمائی یہ خود آپ کی زبانی سنئے۔

"شیخ الاسلام حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلی نے مجھ عاجز کے حال پر کمال شفقت فرمائی۔شیخ نے مجھ سے ریاضتیں اس طرح بتدریج کرائیں کہ طبیعت پر ذرہ برابر ناگواری محسوس نہ ہوتی تھی۔ایک روز حضرت شیخ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم صبح کی نماز کے لئے جو وضو کرتے ہو وہ بعد طلوع باقی رہتا ہے یا نہیں۔میں نے عرض کیا جی ہاں باقی رہتا ہے۔فرمایا اچھا ہوا گر تم اسی وضو سے دوگانہ اشراق پڑھ لیا کرو۔میں نے عرض کیا بہت اچھا، پھر فرمایا دوگانہ شکرانہ، استخارہ واستعاذہ بھی پڑھ لیا کرو۔چند روز بعد فرمایا چاشت کی چار رکعت بھی ملا لیا کرو۔میں ہمیشہ رجب میں روزے رکھا کرتا تھا حضرت نے فرمایا شعبان میں بھی؟ میں نے عرض کیا شعبان میں صرف 9 روزے رکھتا ہوں۔ارشاد ہوا کہ اگر اکیس روزے اور رکھ لیا کرو تو تمہارے پورے تین مہینے کے روزے ہو جایا کریں گے۔میں شوال میں روزے بھی رکھا کرتا تھا انہیں ایام میں قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے خواجگان صوم داؤدی نہیں رکھا کرتے تھے۔صوم دوام رکھا کرتے تھے تم بھی صوم دوام رکھا کرو۔(ملفوظات جوامع الکلام) 757 ہجری میں آپ کو خلیفہ نامزد کر کے حضرت چراغ دہلی بہشت سدھار گئے۔

آپ بیعت کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ مرید کے ہاتھ پر رکھ کر فرماتے تم نے اس ضعیف اور اس ضعیف کے خواجہ، اور خواجہ کے خواجہ اور تمام مشائخ سلسلہ سے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ نگاہ اور زبان کی حفاظت کروں گا اور طریقہ شریعت پر قائم رہوں گا۔تم نے اسے قبول کیا؟ مرید عرض

کرتا ہاں میں نے قبول کیا۔ آپ فرماتے الحمد للہ رب العالمین۔

46 سال کی عمر میں آپ نے والدہ کے اصرار پر سید احمد ابن سید جمال الدین مغربی کی بیٹی سے شادی کی۔

800 ہجری تک آپ دہلی میں ہی سجادہ نشین رہے لیکن 801ء میں جب امیر تیمور دریائے اٹک عبور کر کے پنجاب میں داخل ہو گیا تو آپ گوالیار چلے گئے اور وہاں سے 90 سال کی عمر میں ایک بار پھر دولت آباد آ گئے جہاں سے آپ 65 سال قبل پندرہ سال کی عمر میں والدہ کے ساتھ دہلی گئے تھے۔

سلطان احمد بہمنی کو آپ کی دولت آباد آمد کا پتہ چلا تو اس نے دولت آباد کے گورنر کو ہدایت کی کہ حضرت گیسو دراز کو "گلبرگہ" تشریف لانے کی درخواست پیش کرو۔ حضرت نے درخواست قبول کی گلبرگہ تشریف لے گئے اور شاہی قلعہ کے پیچھے واقع خانقاہ میں مرکز رشد و ہدایت قائم کیا۔

گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آپ کا معمول یہ تھا کہ فرض نماز مسجد میں ادا کر کے سنتیں باہر پڑھا کرتے تھے۔ نماز اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد پابندی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے آخر عمر میں ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔ مریدوں کو ہدایت تھی کہ اوراد معمولہ کے علاوہ نماز اشراق کی چھ رکعتیں قضا نہ ہونے پائیں۔

اشراق کی نماز پڑھ کر اپنے بیٹوں کے ساتھ کھانا تناول فرما کر علم تفسیر و حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ دوپہر کو قیلولہ فرما کر بعد ظہر تلاوت قرآن معمولات میں سے تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد اوابین و نوافل سے فراغت پا کر طالبان راہ طریقت کو تعلیم فرماتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد مریدین و معتقدین کا اجتماع ہوتا۔ دستر خوان بچھایا جاتا۔ تقریباً چالیس پچاس آدمی شریک طعام ہوتے۔ حضرت کا معمول تھا کہ جس مرید پر زیادہ عنایت ہوتی تھی اپنے سامنے کے کھانے میں سے کچھ تناول فرما کر اس کو عطا فرما دیا کرتے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد کچھ دیر گفتگو فرما کر استراحت فرماتے اور بوقت نصف شب بیدار ہو کر نماز تہجد و ذکر و شغل و مراقبہ میں مشغول ہو جاتے تھے۔ جوانی کے زمانہ میں آپ نے

وم دوام اور طے کے روزے رکھے۔ آخر عمر میں بوجہ ضعف و پیرانہ سالی صرف ایام بیض اور ...رس ایام کے روزے رکھتے تھے۔ نماز باجماعت کے آخر وقت تک پابند رہے۔ مریدوں کو ...ہی ہدایت تھی کہ نماز باجماعت قضا نہ ہونے پائے۔

آپ 104 سال 4 ماہ اور 12 روز کی عمر پا کر 16 ذیقعد 825 ہجری کو بعد نماز ...ق واصل بحق ہوئے۔ سلطان احمد بہمنی نے آپ کے مزار پر برصغیر کا بلند ترین گنبد تعمیر کروایا جو ...ں کی عقیدت کا مظہر ہے۔

حضرت گیسو دراز نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

- ملتقط تفسیر القرآن (اول پانچ پاروں کی تفسیر)۔ ☆ شرح مشارق الانوار۔
- معارف شرح عوارف (عربی)۔ ☆ ترجمہ عوارف (فارسی میں)
- شرح تعرف شرح آداب المریدین (عربی) ☆ شرح آداب المریدین (فارسی)
- خاتمہ۔ ☆ شرح فصوص الحکم۔
- شرح تمہیدات عین القضات ہمدانی۔ ☆ شرح رسالہ قشیریہ۔
- خطائر القدس المعروف بہ رسالہ عشقیہ۔ ☆ اسماء الاسرار۔
- حدائق الانس۔ ☆ استقامت الشریعت بطریقت الحقیقت۔
- حواشی قوت القلوب۔ ☆ شرح فقہ اکبر (عربی)
- شرح الہامات حضرت غوث الاعظم۔ وغیرہ

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حضرت سید گیسو دراز اپنی تصنیف کبھی اپنے ہاتھ ...تحریر نہ فرماتے تھے۔ کاتب سے لکھوایا کرتے تھے۔ کسی کتاب کو لکھوانے کے بعد آپ نے کبھی ...نظر ثانی نہیں کی اور نہ اس کو دوبارہ پڑھوا کر سنا۔



صدیقی بزرگانِ دین

حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما

آپ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے ہیں۔ آپ کا نام پہلے عبدالکعبہ تھا۔ ایمان لانے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن نام رکھا۔ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے موقع پر آپ قریش مکہ کی طرف سے لڑ رہے تھے ایک موقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اُن کی زد میں آگئے لیکن انہوں نے باپ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ مسلمان ہونے کے بعد جب یہ واقعہ انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو سنایا تو آپ نے فرمایا بیٹا تو نے مجھے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا مگر تو میری زد میں آجاتا تو کبھی بھی میں بیٹا سمجھ کر تجھے نہ چھوڑتا بلکہ اسلام کا دشمن سمجھ کر قتل کر ڈالتا۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ اس موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بے حد خوشی ہوئی اور انہیں اپنے پاس مدینہ شریف بلا لیا۔

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اپنی بے مثال حربی صلاحیتوں کو اسلام کے دفاع کے لئے وقف کر دیا۔ جنگ یمامہ میں دشمن کے سات زبردست جنگجوؤں کو آپ نے اپنی بے مثال تیر اندازی سے ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد قلعہ کی فصیل کے ایک شگاف سے مسلمان اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن دشمن کا ایک جانباز اور فدائی قسم کا فوجی عہدیدار اس شگاف میں تن کر کھڑا ہو گیا اور مسلمان لشکر کا راستہ روک لیا۔ ایسے میں حضرت عبدالرحمٰن اس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھے اور اس فدائی کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور اسے راستے سے ہٹا کر مسلمانوں کا قلعہ میں داخلہ ممکن بنایا اور اس طرح جنگ یمامہ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ بعض مؤرخین اور ماہرین حرب نے لکھا کہ حضرت عبدالرحمٰن عرب کے ان جنگجوؤں میں شامل ہیں

جنہیں ایک ہزار کے لشکر کے برابر تسلیم کیا جاتا ہے۔

عہد فاروقی میں حضرت خالد بن ولید کی زیر کمان غسانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے قنسرین کے معرکہ میں جب حضرت عبدالرحمٰن نے غسانی فوج کے پانچ اہم فوجی افسروں کو ایک ایک کر کے فنا کے گھاٹ اتارا تو نامی گرامی اور بہادر غسانی بادشاہ طیش میں آ کر خود میدان میں اُتر آیا۔ حضرت عبدالرحمٰن پانچ دشمنوں سے لڑ لڑ کر اپنی کافی توانائی خرچ کر چکے تھے اور زخمی بھی ہو چکے تھے پھر بھی ایمانی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے غسانی بادشاہ کا چیلنج قبول کر کے پھر لڑنا شروع کیا اور جوانمردی اور استقامت کے وہ جوہر دکھائے کہ بادشاہ کو ماننا پڑا کہ ہم بادشاہ ہو کر بھی محمد عربی ﷺ کے غلاموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بادشاہ لڑتے لڑتے نڈھال ہو گیا اور اپنے کیمپ کی طرف پلٹا تو آپ بھی اپنے لشکر میں واپس آ گئے۔

یرموک کی جنگ میں ساٹھ ہزار غسانیوں کے مقابلہ میں حضرت خالد بن ولید نے صرف ساٹھ مسلم شہسوار تیار کئے اور ان ساٹھ نے ساٹھ ہزار کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ اُن ساٹھ شہسواروں میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہما

اپنے بڑے بھائی حضرت عبدالرحمٰن سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے بلکہ جوانی کے ایام میں جبکہ حضرت رسول کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ غار ثور میں تھے تو آپ کے کھانے وغیرہ کی انتظام دہی حضرت عبداللہ بن ابوبکر اور ان کی بہن حضرت اسماء بنت ابوبکر ہی کیا کرتے تھے اور آپ کو کفار کی کارروائیوں سے آگاہ رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ نے فتح مکہ، حنین اور طائف میں حضور ﷺ کی زیر کمان جنگیں لڑیں۔ طائف کے محاصرے کے دوران ابو محجن ثقفی نامی کافر کا زہر آلود تیر آپ کو لگا۔

اس وقت تو زخم اتنا کاری معلوم نہ ہوا لیکن اندر ہی اندر اس کا زہر اپنا کام کرتا رہا اور ۱۱ ہجری کے ماہ شوال میں اس کے اثر سے آپ نے شہادت پائی۔

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آل میں ہوئے ہیں۔ آپ کی ولادت ۵۳۶ ہجری میں عراق سے آذربائیجان جانے والے پہاڑی راستے پر واقع قصبہ ''سہرورد'' میں ہوئی اس نسبت سے سہروردی کہلائے۔

آپ حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ کے عقیدتمندوں میں شامل تھے اور حضرت غوث پاک بھی آپ سے بے حد پیار فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اے عمر آپ عراق کی آخری مشہور شخصیت ہوں گے''۔ آپ ۶۳۲ ہجری میں فوت ہوئے۔ حضرت شیخ سعدی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، سید جلال الدین بخاری اوچ شریف اور شیخ حمید الدین ناگوری رحمہم اللہ آپ کے مشہور خلفاء ہیں ویسے حضرت بابا فرید بھی آپ کو ملے اور فیض پایا۔

مولانا جلال الدین رومی جو علامہ اقبال کے فکری مرشد ہیں۔ آپ بھی صدیقی ہیں۔ ''مثنوی مولانا روم'' آپ کی وہ شاندار تصنیف ہے جس کے بارے میں مولانا عبدالرحمٰن جامی نے کہا تھا۔

مثنویٔ مولویٔ معنوی　　ہست قرآن در زبان پہلوی

آپ ۶۰۴ ہجری میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھ سال کے تھے کہ آپ کے والد مولانا بہاء الدین آپ کو نیشاپور لے گئے۔ وہاں سے مختلف اسلامی شہروں کی سیاحت کرتے کرتے ۱۲ سال کے عرصے میں ''لارندہ'' پہنچے۔ یہاں مولانا رومی کی شادی ہوئی اور یہیں آپ کے والد مولانا بہاء الدین فوت ہوئے۔ اور یہیں آپ کے گھر ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ بعد آپ مستقل طور پر روم کے شہر قونیہ چلے گئے۔

قونیہ میں مولانا روم حضرت شمس تبریزی کے مرید ہوئے اور سلوک کی منازل طے کیں۔ ہفتہ ٦ جمادی الثانی ٦٧٢ ہجری کو فوت ہوئے۔

حضرت شیخ فخر الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ

ایران کے شہر ہمدان میں ٦٠٠ ہجری میں صدیقی خاندان میں حضرت شیخ فخر الدین پیدا ہوئے حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی نے آپ کو "عراقی" کا تخلص عطا کیا اور آپ شیخ فخر الدین عراقی مشہور ہو گئے۔ حضرت شہاب الدین عمر سہروردی نے ہی آپ کو ہند کا سفر کرنے کا حکم فرمایا۔ آپ بغداد سے ملتان آئے اور شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے فیضان صحبت پایا۔ حضرت بہاء الدین زکریا نے آپ کو اپنی دامادی میں لے لیا اور خلافت سے بھی نوازا۔ دمشق میں ٦٨٨ میں فوت ہوئے اور حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کے جوار میں مدفون ہوئے۔

حضرت ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ

شہنشاہِ ہند حضرت عالمگیر اورنگ زیب نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد حضرت شیخ احمد بن ابی سعید بن عبدالرزاق المعروف ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ بھی صدیقی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو چکے تھے اور سولہ سال کی عمر میں عالم فاضل بن چکے تھے۔ یکم ربیع الاول سے لے کر ٧ جمادی الاول تک "نور الانوار شرح منار" تصنیف کی۔ جب بادشاہ نے فتاویٰ عالمگیری کی تصنیف و تالیف کا کام شروع کرایا تو آپ کو نگران مقرر کیا۔ ١١٣٠ ہجری میں بھارت کی راجدھانی دہلی میں فوت ہوئے اور میت آبائی علاقہ امیٹھ لے جا کر دفنائی گئی۔

حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ

دہلی کے اکابر علماء سے دینی علوم پڑھ کر فارغ ہوئے تو مدینہ شریف کے شیخ طریقت حضرت شیخ یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ کشکول کلیمی آپ کی مشہور کتاب

ہے جو اردو میں منتقل ہو چکی ہے۔ "رود کوثر" میں شیخ اکرم نے لکھا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر کا بیٹا بہادر شاہ شیعہ ہو جانے کے بعد اپنے عقائد سے تائب ہوا تو آپ ہی کا مرید ہوا تھا۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے وصال کے بعد سلسلہ چشتیہ نظامیہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ آپ نے از سر نو چشتیہ سلسلہ کی شیرازہ بندی کی۔ ٤ ربیع الاول ١١٤٢ ہجری میں فوت ہوئے۔ دہلی میں آپ کا مزار شریف مرجع خلائق ہے۔

محبّ النبی حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

آپ بھی خانوادہ صدیقیہ کے فرد فرید تھے۔ لفظ "مولانا" برصغیر میں پہلے پہل آپ کے لئے ہی استعمال ہوا۔ آپ کے والد حضرت نظام الدین اورنگ آبادی تھے حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی کے مرید، شاگرد اور خلیفہ تھے۔ جب مولانا فخر الدین محبّ النبی دہلوی پیدا ہوئے تو حضرت شاہ کلیم اللہ نے ہی آپ کا نام رکھا تھا۔ مولانا فخر الدین محبّ النبی نے آگے چل کر ثابت کر دیا کہ دادا پیر نے ان کا نام بالکل ٹھیک رکھا تھا۔ آپ اسم بامسمیٰ ثابت ہوئے۔

شرح وقایہ، مشارق الانوار اور نفحات الانس وغیرہ اپنے والد ماجد سے پڑھیں، ہدایہ مولانا عبدالحکیم سے پڑھی۔ شمس بازغہ اور فصوص الحکم میاں محمد جان سے پڑھیں۔ شاگردی کے ساتھ ساتھ والد ماجد کی بیعت بھی کی۔

لاہور میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اعتکاف کیا اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر تین دن رات قیام فرمایا پھر پاکپتن شریف حاضری دی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے باطنی اشارے پر پچیس برس کی عمر میں اورنگ آباد سے پیدل دہلی پہنچے اور تمام عمر دین متین کی خدمت میں گزار کر ١١٩٩ ہجری میں فوت ہو کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر

عزیزی کے مقدمہ میں آپ کی دینی خدمات کو خوب سراہا ہے اور بہادر شاہ ظفر نے اپنے دیوان میں جگہ جگہ آپ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ آپ یوں تو پورے ہندوستان کی مذہبی فضا پر چھائے رہے لیکن آپ کا فیض جنوبی پنجاب میں اپنے جوبن پر ہے۔ خواجہ نور محمد مہاروی آپ ہی کی روحانی امانتیں لے کر لوٹے اور شاندار خانقاہ قائم کی۔ اُن سے حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ مرید ہوئے اور تونسہ شریف کو روحانیت کا گہوارہ بنایا اُن سے خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے فیض پایا اور سیال شریف میں عظیم خانقاہ قائم کی جہاں سے پیر سید مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی ہستی نے تربیت پائی۔ دراصل یہ سارا فیض حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک عظیم بیٹے مولانا محب النبی فخر الدین دہلوی کا ہے۔

آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا قطب الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ ہی کی طرح تمام عمر خدمت دین کے جذبہ سے سرشار ہو کر کام کرتے رہے۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر آپ ہی کے مرید سعید تھے بلکہ بعض نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر مولانا قطب الدین دہلوی کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ بہادر شاہ ظفر لکھتے ہیں:

مرید قطب الدین ہوں خاکپائے فخر دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں اُن کا غلام کمتریں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

آپ کی وفات ۸ محرم ۱۲۳۳ھ کو ہوئی اور اپنے والد کے پہلو میں مزار شریف بنا۔ بہادر شاہ ظفر نے آپ کے مزار کے ساتھ اپنے لئے جگہ رکھی تھی مگر جب انگریز ان کو گرفتار کر کے رنگون لے گئے تو ظفر نے پیرومرشد کے ہجر میں یہ مقبول عام شعر کہا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

حضرت قاری عبدالملک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ عرب شریف سے سندھ اور پھر قصور تشریف لائے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ حضرت خواجہ عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ روحانی فیوض و برکات کے منبع اور قرأت قرآن کے ماہر استاد تھے۔ ان کے بیٹے حافظ خواجہ غلام مرتضیٰ تھے۔

حافظ خواجہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بلھے شاہ قصوری اور حضرت پیر سید وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ہیں حضرت پیر وارث شاہ صاحب نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ہیر وارث شاہ میں اس بات کا اظہار ان الفاظ فرمایا ہے۔

وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے دا اے تے شاگرد مخدوم قصور دا اے

حضرت حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں سید زادوں کی کما حقہ علمی و روحانی تربیت فرمائی علم صرف، نحو، فقہ، اصول فقہ، منطق، عروض، بیان، حدیث اور علم تفسیر کی دولت عظمیٰ سے بھی خوب ہنرمند فرمایا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں علم کے ایک بحر بے کنار تھے اس دور کے ہزاروں لوگوں نے آپ سے کسب فیض حاصل کیا اور اپنی علمی رُوحانی پیاس بجھائی۔
حضرت مخدوم حافظ غلام مرتضیٰ قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے والد عبدالملک کے علمی و روحانی فیض کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ صدیقی قصوری رحمۃ اللہ علیہ کسبی لدنی اور روحانی علوم وفنون کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر حقیقت و معرفت کا بحر بے کراں تھے۔

خواجہ حافظ غلام مرتضیٰ قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے چار صاحبزادے ہیں جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) حضرت خواجہ حافظ محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ
(۲) حضرت خواجہ محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ
(۳) حضرت خواجہ شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ
(۴) حضرت خواجہ شاہ غلام مصطفیٰ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ غلام محی الدین

حضرت خواجہ غلام محی الدین دائم الحضوری قصوری ۱۲۰۲ھ بمطابق ۱۷۸۷ء کو قصور میں پیدا ہوئے آپ کی عمر مبارک ابھی ایک سال کی تھی کہ آپ کے والد حضرت خواجہ غلام مصطفیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۲۰۳ھ بمطابق ۱۷۸۸ء میں انتقال ہو گیا ان کا مزار بھی قصور میں ہے۔

آپ کے چچا جان حضرت شیخ محمد نے بڑے احسن طریق سے آپ کو علمی و روحانی تمام منازل طے کرائیں۔ پھر آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی سند لی اور شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت۔

حضرت خواجہ غلام محی الدین دائم الحضوری قصوری رحمۃ اللہ علیہ اولاد کے لئے تعویذ دیا کرتے تھے۔ آپ کی کرامت مشہور ہو گئی تھی کہ جس کو فرما دیتے یہ تعویذ چاندی میں بند کرا لو اللہ تعالیٰ اس کو بیٹی دیتا ہے اور جسے فرماتے کہ یہ تعویذ چمڑے میں بندھا لو اسے اللہ تعالیٰ بیٹے کی نعمت سے نواز دیتا ہے۔ آپ کے اس فیض کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور اس وقت آپ کی اپنی نرینہ اولاد نہ تھی بدعقیدہ اور حاسد لوگوں نے آپ سے سوال اور اعتراض کیا کہ اگر آپ ولی اللہ ہیں اور لوگوں کو بیٹے اور بیٹیاں بانٹتے ہیں تو خود اللہ تعالیٰ سے اولاد کیوں نہیں لے لیتے۔ آپ نے فرمایا میں اللہ کی رضا پر راضی ہوں اور جاؤ میں پیش گوئی اور بشارت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایک سال کے بعد مجھے بھی بیٹا عطا فرمائے گا۔ جو ظاہری و باطنی علوم سے فیض یاب ہوگا۔ زمانے کا ولی ہوگا اور اپنی طبعی زندگی گزار کر دنیا سے پردہ پوشی کرے گا۔ بدعقیدہ لوگوں نے کہا کہ ایسے نہیں تم سال کے بعد اپنی بات سے انکاری بھی ہو سکتے ہو تحریری طور پر لکھ کر دو تاکہ ایک سال گزر جانے کے بعد ہم لوگوں کو بتا سکیں کہ یہ خواجہ صاحب کی تحریر ہے اور ان کی جھوٹی کرامت کا ثبوت ہے۔

آپ نے فرمایا میں پھر صرف تمہیں نہیں لکھ کر دوں گا بلکہ ساری عوام الناس

ہر خاص و عام کے لئے لکھ کر دوں گا انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے اس کے بعد آپ نے ایک مختصر مگر جامع کتاب تصنیف فرمائی جو "تحفہ رسولیہ" کے نام سے معروف ہے۔

اس میں حضور ﷺ کے حلیہ مبارک کو تحریر فرمایا اور حضور ﷺ کے چند معجزے تحریر کئے اور آخر میں حضرت مولانا عبدالرسول رحمۃ اللہ علیہ کی بشارت دی اور تحریر کیا کہ اس کتاب کی تحریر کے ٹھیک ایک سال بعد مجھے اللہ تعالیٰ بیٹا عطا کرے گا۔ جس کا نام میں نے ابھی سے عبدالرسول تجویز کیا ہے جو ظاہر و باطن ہر دو علوم سے مالا مال ہوگا۔ زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ ہوگا اور اپنی طبعی عمر پائے گا یہاں تک کہ ان کی عمر کا تذکرہ کرتے ہوئے لفظ "مزید" کہہ کر ان کی عمر مبارک بھی بتا دی گئی لفظ مرید کے ۶۱ عدد بنتے ہیں اور حضرت عبدالرسول کی عمر مبارک ۶۱ برس ہوئی۔ اس طرح ٹھیک ایک سال بعد حضرت خواجہ مولانا عبدالرسول قصوری پیدا ہوئے اور ۶۱ برس کی عمر شریف پا کر ۱۲ محرم ۱۲۹۴ھ بمطابق ۱۸۷۷ء کو بروز منگل اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور قصور ہی میں اپنے والد بزرگوار حضرت خواجہ غلام محی الدین دائم الحضوری قصوری کے احاطہ میں دفن ہوئے۔

حضرت الشاہ حافظ محمد ابراہیم

خواجہ حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے ہیں آپ کا شمار اس دور کے جید علما دین اور روحانی پیشواؤں میں ہوتا ہے آپ کا حلقہ ارادت کافی وسیع تھا۔ قصور کے اس دور کے بہت بڑے رئیس حاجی رانجھے خاں آپ کے مرید تھے۔

ان کا مزار شریف بھی قصور کے بڑے قبرستان میں حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ قصوری کے پہلو میں ہے ہر سال ۲۱-اپریل کو زیر قیادت صاحبزادہ غلام مصطفیٰ صدیقی آپ کا عرس مبارک مسلم آباد لاہور میں منایا جاتا ہے۔

آپ کی اولاد میں سے کثیر تعداد میں علمائے دین اور اولیاء و مشائخ ہوئے ہیں جن میں حضرت خواجہ حاجی محمد عثمان، مولانا غلام محمد، مولانا غلام قادر، حاجی

عبدالملک، مولانا محمد امین، مولانا محمد عمر اچھروی، درویش حق الحاج بابا عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالرحیم، حافظ نور احمد، مولانا عبدالغفور، مولانا عبدالمالک، مولانا غلام محی الدین، مولانا معین الدین، مولانا مفتی غلام قادر، مولانا حافظ فقیر اللہ، مولانا عبدالخالق، مولانا غلام مصطفیٰ المعروف پیر صدیقی، مولانا غلام مرتضیٰ، صاحبزادہ ڈاکٹر رحیم بخش صدیقی، مولانا کریم محی الدین صدیقی، مولانا حافظ عبدالقادر شامل ہیں۔

مناظر اسلام مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی لکھتے ہیں: سنیوں کے مایہ ناز عالم دین، مناظر اور عوامی خطیب مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ شیرو کا ہنہ نزد قصور ضلع لاہور میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے مولانا کے والد مولوی محمد امین بن عبدالمالک قریشی حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری کے خاندان میں سے تھے قرآن پاک والد مکرم سے پڑھا فارسی کتابیں مولانا صلاح الدین سے پڑھیں۔

صرف و نحو اور اصول لکھو کے فیروز پور میں مولانا محمد حسین اور عطا اللہ لکھوی سے پڑھی، منطق و معقولات قصور کے مدرسہ فریدیہ میں پڑھی اور پھر بعض کتابیں مولانا محمد عالم سنبھلی سے مدرسہ رحیمیہ نیلا گنبد لاہور میں پڑھتے رہے کتب حدیث کے لئے آپ دہلی کے مدرسہ رحمانیہ میں داخل ہوئے مولوی محمد عبداللہ امرت سری ثم روپڑی (وہابی) سے سند حاصل کی۔

مولانا احمد علی میرٹھی سے صحاح ستہ کا مطالعہ کیا آپ ۱۹۱۸ء میں فارغ التحصیل ہو کر قصور آئے آپ نے ٹھیٹھ پنجابی زبان میں تقریروں کا آغاز کیا قرآن پاک خاص سادہ انداز میں پڑھتے اور مناظرانہ انداز سے دیہاتی عوام کے محبوب واعظ بن گئے وہابی دیوبندی آپ سے ٹکر لیتے مگر منہ کی کھا کر میدان مناظرہ سے بھاگ جاتے۔

آپ ۱۹۳۴ء میں لاہور قیام پذیر ہوئے تو آپ کی شہرت پنجاب میں پھیل گئی آپ کے موضوعات دیوبندی، وہابی، شیعہ اور مرزائی عقائد پر برق بار تنقید تھے۔

اس فن میں آپ کو کمال حاصل تھا، معاندین کی کتابوں کے حوالے آپ کو ازبر تھے اور نادر کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ آپ کے پاس رہتا۔ آپ بڑی جرأت سے میدان مناظرہ میں پہنچتے اور مخالف فریق کو للکارتے آپ کی تصانیف میں سے مقیاس حنفیت، مقیاس مناظرہ، مقیاس خلافت، مقیاس نور، مقیاس الصلوٰۃ کے کئی ایڈیشن چھپے، مقیاس وہابیت آپ کی وفات کے بعد چھپی اور مقیاس توحید، مقیاس میلاد، مقیاس حیات، مقیاس اسلام ابھی تک مسودات کی شکل میں ہیں۔ آپ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور آپ کی دعا سے ہر میدان میں فتح یاب ہوئے۔

بے باک مرد حق تھا مجاہد دلیر تھا
وہ شرقپور کے شیر محمد کا شیر تھا

آپ نے ۱۵۰ مناظرے جیتے اور اپنے عقائد کے سکے بٹھا دیئے۔ اچھرہ لاہور میں دار المقیاس تعمیر کیا۔ ماہنامہ ''المقیاس'' جاری کیا۔ جمعیۃ المسلمین قائم کی۔ المقیاس پریس لگایا۔ حضرت داتا گنج بخش کی مسجد میں سولہ سال تک خطابت فرمائی اور اپنے خطاب سے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سنی عوام کو زندہ کر دیا۔

آپ بڑے جری، بہادر اور فاضل مناظر تھے آپ کے صاحبزادوں میں سے مولانا عبدالوہاب صدیقی مبلغ انگلینڈ، مولانا عبدالتواب صدیقی، مولانا سلطان باہو، مولانا فقیر محمد اور محمد ظفر آپ کے علمی جانشین ہیں۔ آپ ذیقعد ۱۳۹۱ھ میں فوت ہوئے۔ مدفن اچھرہ لاہور میں ہے۔

(علماء اہلسنت و جماعت لاہور، مطبوعہ مکتبہ نبویہ، لاہور)

حضرت مولانا محمد عمر اچھروی کے فرزندوں نے تو بہت نام کمایا لیکن پوتوں میں وہ دینداری رہی نہ خدمتِ اسلام کا وہ جذبہ جواں رہا۔ البتہ ان کے تین پوتے نعت خوانی کے میدان میں خوب چمکے جب ان کو زرق برق لباس پہنے نعت پڑھتے دیکھتا ہوں تو مولانا محمد عمر صدیقی اچھروی کی باوقار سادگی یاد آتی ہے۔ ہاں مناظر اسلام کے

بھائی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صدیقی کے پوتے ابھی بھی اپنی مسند رشد و ہدایت پر متمکن نظر آتے ہیں۔ "تحفۂ رسولیہ" کا حضرت مولانا عبدالرحمٰن صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک پوتے علامہ عبدالمصطفیٰ صدیقی نے ہی ترجمہ کیا ہے اور اس نایاب کتاب کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ راقم نے اس خانوادہ کی معلومات کے لئے اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

شیخ الدلائل حضرت **مولانا عبدالحق مہاجر مکی** بھی صدیقی بزرگ تھے الہ آباد، بھارت میں پیدا ہوئے۔ بڑا نام کمایا۔ غدر کے دوران ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے وہاں پہنچ کر روحانی مراتب میں اتنی بلندی ہوئی کہ مکہ مکرمہ کے قطب کا درجہ حاصل کیا۔ ہمارے بہت بڑے بڑے بزرگ ان سے تلمذ کا شرف پاتے رہے مثلاً مولانا ضیاء الدین مدنی، پیر جماعت علی شاہ، محدث علی پوری وغیرہ۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آل کے ایک عظیم بزرگ ہوئے ہیں شاہجہاں بادشاہ آپ کی دینی خدمات اور خصوصاً آپ کے قلمی کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے روغن بادام کا ایک بہت بڑا برتن بھر کے آپ کی خدمت میں ارسال کیا کہ جب تصنیف و تالیف کا کام کریں تو اس برتن میں پیر ڈال کر بیٹھ جایا کریں کہ دماغ تر رہے اور ضعف دماغ کا خطرہ نہ رہے۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے ہی "مجدد الف ثانی" کو یہ خطاب دیا تھا۔ جس کے جواب میں حضرت مجدد پاک نے آپ کو 'آفتاب پنجاب' کے خطاب سے نوازا۔

قطب مدینہ حضرت **مولانا ضیاء الدین مدنی** خلیفہ حضرت امام احمد رضا بریلوی بھی صدیقی خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے ہوتا ہوا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کی عظمت اسی سے واضح ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مقدس مدینہ منورہ کے قطب ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ



حضرت مفتی محمد علیہ الرحمۃ سے مفتی غلام سرور لاہوری علیہ الرحمۃ تک

شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے خاندان کے پہلے بزرگ جو لاہور آئے وہ خواجہ حضرت مولانا مخدوم مفتی شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ ابن شیخ صالح ابن شیخ شہاب الدین بن حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی تھے۔ جنہیں سلطان بہلول لودھی نے 894ء میں لاہور کا سرکاری مفتی بنا کر تعینات کیا اور ذریعہ معاش کے لئے ہیبت پور کا علاقہ انعام میں دیا۔ حضرت مولانا شیخ محمد مفتی بن کر لاہور تشریف لائے تو موچی دروازہ لاہور کے اندر محلہ علاول خان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ آج کل یہ محلہ حویلی میاں خان کہلاتا ہے۔ آپ نے اس علاقے میں اپنے علمی ماحول، خاندانی روایات اور ثقافتی ذوق کے مطابق ایک محلہ آباد کیا، جو پانچ صدیوں سے محلہ کوٹلی مفتیان کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت مولانا شیخ محمد نے منصب افتاء کی سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ساتھ ہی طریقت کے سہروردی سلسلے کی ترویج و اشاعت اور مریدین کی تربیت کا اہتمام فرمایا۔ حضرت مولانا شیخ محمد تمام عمر عہدہ افتاء پر کام کیا اور اپنی زندگی کو اسلامی و مشرقی علوم کی احیاء کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے سلطان بہلول لودھی کے دور میں لاہور میں وفات پائی۔ وفات کے بعد آپکے فرزند مولانا مفتی کمال الدین آپ کے سجادہ نشین ہوئے۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا بڑا قدردان تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا تو آپ کے درس میں ضرور شامل ہوتا۔ حضرت مفتی شیخ کمال الدین بھی اپنے والد ماجد کی طرح تمام عمر دین وملت کی خدمت کرنے کے بعد جب بہشت سدھارے تو ان کے بیٹے حضرت مفتی عبدالصمد جانشین ہوئے۔ ان کے بعد ان کے فرزند مفتی عنایت اللہ اور ان کے بعد قاضی مفتی محمد طاہر لاہور کے نامور علماء میں سے تھے۔ جنہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتیں اہل لاہور کی دینی، علمی اور روحانی

تربیت میں صرف کیں۔وفات سے پہلے آپ نے اپنے بیٹے مفتی عبدالسلام کو اپنی زندگی میں ہی اپنا جانشین نامزد کر کے مسجد مفتیاں کی امامت وخطابت اور انتظامی معاملات بھی سونپ دیئے تھے۔مفتی عبدالسلام نے 25 برس تک مسلمانان لاہور کے دل ودماغ کو علم اور روحانیت سے سیراب کیا۔مفتی عبدالسلام کا عہد (دورِ اکبری یعنی لادینی دور) بڑا پرآشوب اور فتنہ پرور تھا۔اس دور میں جدیدیت کے مارے ہوئے ماہرین تعلیم نے مختلف علاقوں میں سر اُٹھایا اور اسلامی نظام تعلیم کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کر کے مسلمانوں کی علمی وفکری وحدت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن مفتی عبدالسلام ان تمام جدید فتنوں سے دامن بچا کر انتہائی دل جمعی اور اعتماد کے ساتھ قدیم علوم عام کرتے رہے اور اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر کتاب وسنت کی روشنی پھیلاتے رہے، آپ نے 1035ھ میں جہانگیر کے عہد میں انتقال فرمایا۔آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے مفتی محمد جمعون، مفتی برہان الدین اور مفتی کمال الدین، شاہجہاں اور عالمگیر کے ادوار میں اپنے بزرگوں کے عظیم علمی وروحانی ورثوں کے امین رہے اور اسلامی نظام تعلیم کا علم بلند کرتے رہے۔حضرت مفتی شیخ کمال الدین اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے توکل اور استغنا کے پابند تھے، کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں گئے۔آپ کی محفل میں یہ خاص بات تھی کہ علمی اور دینی باتوں کے علاوہ کبھی کسی کو دنیاوی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔مفتی محمد تقی، حضرت مولانا شیخ کمال الدین کے بڑے بیٹے اور خلیفہ مجاز تھے۔امیر لوگوں سے ملنا پسند نہ فرماتے، سادہ لباس پہنتے تھے اور بے پرواہ مزاج کے مالک تھے۔1131ھ میں محمد شاہ رنگیلا کے دور میں فوت ہوئے۔آپ کے بیٹے مفتی محمد تقی بڑے قابل مدرس تھے، دوران تدریس طلباء کتنے ہی مشکل مسائل آپ کے سامنے پیش کرتے، آپ انہیں بڑی آسانی اور بے تکلفی سے حل فرما دیتے۔آپ کے بیٹے مفتی محمد ایوب جو خواجہ ایوب کے نام سے مشہور ہوئے، اپنے دور کے بہت بڑے صوفی تھے۔حضرت مولانا جلال الدین رومی سے گہری عقیدت اور لگاؤ رکھتے تھے اور اسی تناظر میں مثنوی مولانا روم کا درس بڑے اہتمام سے دیا کرتے تھے۔ایک روز آپ مثنوی شریف کا درس دے رہے تھے ایک شخص کسی شعر کے معانی کے بارے میں بار بار سوال کرتا رہا۔آپ اس

شعر کے معانی سمجھاتے رہے لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔رات کو اس شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا روم سے فرما رہے ہیں کہ خواجہ ایوب ہمارے اویسی مرید ہیں، انہیں ہمارا روحانی فیضان حاصل ہے اور وہ شعر کے جو معانی بیان کر رہے ہیں وہی درست ہیں۔صبح کو وہ شخص نادم ہو کر حضرت خواجہ ایوب کے درس مثنوی میں حاضر ہوا اور معافی مانگ کر آپ کا مرید ہو گیا۔

آپ نے حضرت مولانا روم سے روحانی طور پر اجازت لے کر مثنوی شریف کی ایک زبردست شرح لکھی جو شرح ایوبی کے نام سے مشہور ہے اور فارسی ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔یہ مثنوی 1114ء میں مکمل ہوئی۔آپ نے جمعرات 21 جمادی الثانی 1155ء محمد شاہ رنگیلے کے دور میں وفات پائی اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور سنی عالم دین حضرت مولانا سید احمد توختہ ترمذی کی بیٹیوں (بیبیاں پاکدامن) حضرت بی بی حاج اور حضرت بی بی تاج کے مزارات کے قریب دفن ہوئے۔حضرت بابا بھلے شاہ کے پیر ومرشد حضرت شاہ عنایت قادری آپ کے ہم عصر تھے۔حضرت خواجہ ایوب کے فرزند حافظ رحم اللہ سہروردی 1190ھ میں شاہ عالم ثانی کے زمانے میں فوت ہوئے۔آپ کے بیٹے مفتی محمد رحیم اللہ کا دور سیاسی عدم استحکام کا دور تھا۔دہلی انتہائی کمزور ہو چکا تھا۔ایران کے نادر شاہ کے حملے سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کی یورش نے مغل حکمرانوں کے اعصاب کمزور کر دیئے تھے۔اس دور میں پنجاب کا حال بہت ابتر تھا۔لاہور ان دنوں بیرونی حملہ آوروں کا تختہ مشق بنا ہوا تھا۔جب تک احمد شاہ ابدالی کی فوجیں لاہور میں رہتیں، سکھوں کے جتھے روپوش رہتے اور جب احمد شاہ ابدالی افغانستان چلا جاتا تو سکھ لٹیرے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر لاہور کو لوٹنا شروع کر دیتے۔احمد شاہ ابدالی فوت ہوئے تو سردار لہنا سنگھ، سردار گجر سنگھ، اور سردار سوبھا سنگھ نامی تین سکھ سرداروں نے لاہور میں مخلوط حکومت قائم کر لی۔ابدالی کا پوتا شاہ زمان حملہ آور ہوا تو یہ تینوں سردار لاہور چھوڑ کر بھاگ گئے اور زمان شاہ لاہور پر قابض ہو گیا۔کچھ عرصہ کے بعد 1216ھ میں رنجیت سنگھ پنجاب کا حکمران ہو گیا۔آپ 1235ھ میں رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں فوت ہوئے۔مفتی رحیم اللہ کے بیٹے مفتی غلام محمد نے 9 ربیع الثانی 1276ء میں وفات پائی اور (بیبیاں پاکدامن) کے قبرستان میں دفن ہوئے۔مفتی غلام سرور لاہور آپ کے

سب سے چھوٹے بیٹے تھے جنہوں نے 1244ھ میں آبائی محلہ کوٹلی مفتیاں اندرون موچی دروازہ لاہور میں جنم لیا۔ آپ اپنے خاندان کے آخری فرزند تھے جنہوں نے اسلامی علوم وفنون کا علم بلند کئے رکھا۔ لارڈ میکالے نے انگریزی حکومت کی سرپرستی میں اسلامی نظام تعلیم کو ختم کرنے کے لئے یونیورسٹی، کالجوں اور اسکولوں کا جو جال پھیلایا اُسی نے مسلمان قوم کے علمی مزاج کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ بڑے بڑے دینی گھرانوں کے صاحبزادے بھی اسلامی تعلیم کو بتدریج چھوڑتے چلے گئے اور مغربی نظام تعلیم کی نذر ہو گئے۔ سرسید احمد خان نے جو چسکا مسلمانوں کو لگایا تھا۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ ظالم لگی ہوئی

کے مصداق وہ چسکا ایسا لگا کہ بڑے بڑے دینی اور علمی خانوادے بھی اپنے صاحبزادوں کو خود اپنے ہاتھ سے مغربی نظام تعلیم کے جہنم میں جھونکنے لگے۔ مفتی غلام سرور لاہور کے خاندان نے 5 سو سال تک بڑی شان سے مسند افتا پر فائز رہ کر عوام، حکمران، ملکی آئین و دستور اور عدالتوں کی رہنمائی کا مقدس فریضہ ادا کیا، لیکن اہل کلیسا کے نظام تعلیم نے آج ہماری عدالتی نظام اور آئین و دستور سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ حضرت علامہ اقبال کی بات دل کو لگتی ہے

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین مروّت کے خلاف

آپ 1244ھ بمطابق 1837ء کو لاہور کے مشہور موچی دروازے کے اندر واقع تاریخی محلے کوٹلی مفتیاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مفتی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ انہی سے حکمت پڑھی اور انہی کے مرید ہوئے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے مولانا غلام اللہ فاضل لاہور کے شاگرد ہوئے اور ان سے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، صرف ونحو، معانی، منطق، فلسفہ، تاریخ اور لغت جیسے بے شمار علوم وفنون حاصل کئے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ لاہور کے ایک جاگیردار سردار بھگوان سنگھ کی جائیداد کے نگران رہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کا ایک لائق فائق ہندو شاگرد بہادر لال کنھیا انگریز حکومت میں لاہور ڈویژن کا ایگزیکٹو انجینئر لگا تو اس نے استاد کی قدر دانی کرتے ہوئے اپنے محکمے

کی ایک آسامی پر آپ کو بھرتی کر دیا۔ کچھ عرصہ آپ نے یہ ملازمت جاری رکھی لیکن آپ کی آزاد طبیعت نے نوکری کا یہ بوجھ زیادہ دیر برداشت نہ کیا اور آپ نے یہ نوکری بھی چھوڑ دی اور قرطاس وقلم کی دنیا میں آ گئے جو آپ کا اصل میدان تھا۔ اس میدان میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور عظیم عالم دین صاحب طرز ادیب، خوشگو شاعر مستند، مؤرخ، قابل قدر سیر نگاہ، ممتاز ماہر تعلیم، صوفی باصفا شیخ طریقت اور مصلح قوم کے طور پر تاریخ کے صفحات پر زندہ جاوید ہو گئے۔ جس وقت آپ نوکری چھوڑ کر کتابی دنیا میں آئے مسلم قوم کے لئے یہ مبارک گھڑی تھی کہ ایک ذمہ دار قلم کار قوم کو فکری اور علمی تربیت کے لئے میسر آیا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ نوکری چھوڑنے کا آپ کا فیصلہ نہ صرف درست اور بروقت تھا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اور آپ کے بزرگوں اور مشائخ کی دعائیں اور توجہات شامل تھیں۔

مشیت ایزدی نے آپ کو ہندو اور انگریز کی غلامی سے نکال کر حضور اکرم ﷺ کا وارث بنا دیا۔ آپ سے سیرت، سوانح اور تاریخ نویسی کا وہ کام لیا جو قیامت تک اسلامی اور خصوصاً اردو دنیا کا قابل قدر سرمایہ بن گیا۔ آج اردو کتابوں کی کوئی لائبریری اور کوئی دکان آپ کی لکھی ہوئی کتابوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ ہر بڑے عالم دین کے علمی ذخیرے میں آپ کی تصانیف کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور یونیورسٹی سے لے کر سکولوں کے طلبہ تک آپ کے قارئین میں شامل ہیں۔

لاہور کی مسند افتاء جو پانچ صدیوں سے آپ کے خاندان کے بزرگوں کے پاس تھی انگریز اور سکھ حکومتوں کے دور میں اس کی سیاسی اور قانونی حیثیت تو ضرور متاثر ہوئی لیکن لوگوں کے دلوں میں اس خاندان کا جو وقار اور اعتبار قائم تھا وہ اپنی جگہ رہا اور مسلمان ہر مرحلہ پر آپ سے دینی رہنمائی لیتے رہے اور آپ نے اپنی بہترین صلاحیتوں سے ہر آڑے وقت میں اپنی قوم کی مدد کی اور اپنے خاندان کا علمی وفقہی تشخص اور بھرم قائم رکھا۔

ایک طرح سے آپ کو حضرت شیخ محمد عرف میاں وڈا رحمۃ اللہ علیہ کے ''خاندان مفتیان'' کا آخری علمی چشم وچراغ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ کے بعد آپ کے خاندان میں کوئی حقیقی مفتی نہیں ہوا گو کہ لفظ ''مفتی'' کو بطور پہچان آپ کے خاندان کے لوگ آج تک استعمال کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر پاکستان ریلوے کے آفیسر مفتی محمود عالم ہاشمی، پاک فوج کے کرنل مفتی افتخار الدین، فیروز پور کے مشہور وکیل مفتی غلام صفدر فوقانی، معروف ڈرامہ نگار اور ادیب مفتی گوہر شادانی، یہ سب آپ کے اخلاف ہیں لیکن ان کے ناموں میں لفظ ''مفتی'' ایک خاندانی پہچان کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم نے تمام عمر فقر غیور کے سائے تلے گزار دی لیکن کبھی کسی امیر نواب یا حکومتی شخصیت کی قصیدہ خوانی سے اپنے قلم کو آلودہ نہ کیا۔ آپ کا قلم جب بھی چلا قوم کو ماضی سے جوڑنے کے لئے چلا۔ اپنے بزرگوں کی روحانی امانتیں نئی نسل کو منتقل کرنے کے لئے چلا۔ علوم و فنون کے حیاء کے لئے چلا، مشرقی تہذیب کی ڈوبتی ناؤ کو سہارا دینے کے لئے چلا، اسلامی اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کے لئے چلا، بزرگوں کے علمی ورثہ کو آگے بڑھانے کے لئے چلا، ترقی پسندی جدیدیت اور مغربیت کے مارے ہوئے قلمکاروں کے رد میں چلا، اردو شعر و ادب کی سسکتی اور دم توڑتی اصناف سخن کو آکسیجن دینے کے لئے چلا لیکن آپ نے کبھی بھی انگریزی ادب کو اردو ادب میں ڈھالنے کی کوشش نہ کی۔

آپ کے دوستوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ جس طرح مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا محمد حسین آزاد جیسے لوگ حکومت برطانیہ کے اشارے پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ اگر آپ بھی اسی طرح کتابیں لکھیں تو آپ بھی حکومت کی عنایات خسروانہ سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ مولانا نے غیرت ایمانی سے بھرپور جواب دیا، میں حکومت کے زیر اثر کتابیں لکھ کر ضمیر فروشی نہیں کر سکتا۔ مجھے انگریزی حکومت کی طرف سے سر اور شمس العلماء کا خطاب نہیں بلکہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کی رضا چاہیے۔

آپ کے ایک انگریز واقف کار ڈاکٹر لائیٹنر نے آپ کو پنجاب یونیورسٹی کا ایک اہم عہدہ دلوانے کی پیشکش کی لیکن آپ نے اس پیشکش کو شکریہ کے ساتھ مسترد کر دیا۔ آپ نے کرنل ہال رائنڈ کی اس نئی ادبی تحریک میں شامل ہونے سے بھی انکار کر دیا جو انگریزوں کی خفیہ سرپرستی میں 1874ء میں انگریزوں کے سیاسی مقاصد کے لئے شروع ہوئی تھی۔

اسی زمانے میں طلبہ کے لئے انگریزی کتابوں کے اردو تراجم ہوئے۔ ان کتابوں کی

زبان درست کرنے کے لئے مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کی خدمات لی گئیں۔ ایک بزم مشاعرہ قائم ہوئی۔ اس مشاعرے میں مختلف عنوانات پر نیچرل اور اصلاحی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ انہیں تراجم کے ذریعے سے مولانا آزاد اور حالی کو انگریزی سے کچھ واقفیت ہوئی۔

کرنل ہال رائنڈ کا زمانہ اردو زبان کی ترقی کے لئے بہت اچھا سمجھا جاتا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ اردو نوازی محض سیاسی استحکام کے لئے تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو نظام تعلیم لایا جا رہا تھا وہ کسی طرح بھی مسلم قوم کے قومی مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ تن کے اجلے من کے کالے انگریز مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ان کا علمی زوال بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انگریزوں کو ایسے اہل قلم کی ضرورت تھی جو ان کی پسند کی کتابیں لکھیں اور انگریزی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور فکر و خیال کو غیر محسوس طریقے سے اردو ادب میں ڈھال کر مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتار دیں۔ لیکن حضرت مفتی غلام سرور لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ایسی کسی ادبی تحریک کا حصہ نہ بنے جو مسلمانوں کی کسی بھی پہلو سے مخالفت پر مبنی تھی۔

1884ء میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج کی چندہ مہم کے سلسلے میں پنجاب کا دورہ کیا۔ یاد رہے یہ وہی دور تھا جب اکبر الہ آبادی نے سرسید احمد خان کے بارے میں کہا تھا:

نہ کوئی — کام نہ کوئی دھندا
لاؤ... چندہ لاؤ چندہ

سرسید احمد خان اپنے ایک دوست خان بہادر ڈپٹی برکت علی کے گھر آئے۔ خان بہادر ڈپٹی برکت علی نے موچی دروازے کے باہر واقع اپنی کوٹھی میں لاہور کے معززین کا اجلاس بلایا جس میں مفتی غلام سرور لاہوری کو بھی بلایا گیا۔ جب خان بہادر نے مفتی صاحب کا تعارف سرسید سے کروایا تو سرسید آپ سے مل کر بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے آپ کا نام سنا ہوا تھا آج ملاقات ہوگئی۔ تعارف کے بعد سرسید احمد خان نے اپنے انگریز نواز مشن کے بارے میں مفتی صاحب سے تعاون کی اپیل کی۔ مفتی صاحب نے فرمایا میرا کام دین کی خدمت کرنا ہے۔ میں آپ کے ساتھ

تعاون نہیں کر سکتا کیونکہ آپ کے عقائد درست نہیں۔ سر سید احمد خان آپ کی دو ٹوک بات سن کر لاجواب ہو گئے مزید کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑی۔

آپ بہت ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک سچے عاشق رسول ﷺ اور مدینے کی تڑپ رکھنے والے مخلص عاشق صادق تھے۔ آپ کے سینے میں ہر وقت محبت رسول ﷺ کا چراغ روشن رہتا تھا اور آپ ہمیشہ مدینے کی جدائی میں دلفگار رہتے تھے۔ آپ کی دلی تمنا تھی کہ

پائیں جگہ جو روضہ اطہر کے سامنے
گھر اپنا ہم بنالیں اسی گھر کے سامنے
گھر ہو اگر مدینے میں اپنا تو ہم رہیں
جیتے نبی کے سامنے اور مر کے سامنے

آخر آپ کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ 53 سال کی عمر میں آپ کو حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ کے بھتیجے مفتی سید محمد اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔

لاہور سے آپ پہلے اجمیر شریف حاضر ہوئے۔ وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔ ایک روز یہاں قیام کرنے کے بعد بمبئی روانہ ہو گئے اور کچھ روز بمبئی کے ایک سیٹھ قاضی عبدالکریم کے خوبصورت باغ میں تعمیر شدہ ایک کوٹھی میں قیام پذیر رہے اور قاضی صاحب سے نشست و برخاست رہی اور مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ وہاں سے آپ بحری جہاز کے ذریعے حجاز مقدس پہنچے، حج کا فریضہ ادا کیا اور 1307ھ کے ذی الحج کی 20 تاریخ کو آپ شہر محبت مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن ہجر مدینہ میں شہادت ہی آپ کا مقدر تھی۔ ابھی آپ راستے میں ہی تھے کہ قافلے میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی۔ اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے آپ نے ایک نعت کہی جس کے دو اشعار قارئین کی علمی ضیافت کے لئے پیش ہیں۔

پہنچا سرور عالم کے آج گھر سرور
کھڑا ہے صورت دیوانہ زیر در سرور
اب اپنے در پہ رکھو اسے کہ آئندہ
پھرے جہاں میں نہ آوارہ دربدر سرور

یہ شعر آپ روضہ رسول ﷺ کے سامنے پڑھنا چاہتے تھے لیکن 24 ذی الحج 1307ھ بمطابق 14 اگست 1890ء کو پیغام اجل آگیا۔ ہیضے کی بیماری میں شہید ہو گئے۔ مولانا غلام دستگیر قصوری نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کو "میدان بدر" کے قریب دفن کیا گیا اور آپ کی یہ خواہش پوری ہوئی جس کا اظہار آپ نے اس شعر میں کیا تھا:

ارادہ ہے کہ جب طیبہ کو جاؤں یارسول اللہ
وہاں سے واپسی ہرگز نہ آؤں یارسول اللہ

سرہند سے علی پور تک

شہنشاہ ہند فیروز شاہ تغلق کا شاہی کارواں جب سرہند کے جنگلوں سے گزر رہا تھا۔ شاہی کارواں میں شامل کسی اہل نظر بزرگ نے بادشاہ سے کہا ''مجھے یہاں سے ایک برگزیدہ بندے کی خوشبو آتی ہے جو اس ملت میں یگانہ روزگار اور دین کا مجدد ہوگا'' فیروز شاہ تغلق پر اس بشارت سے سرشاری کی ایک کیفیت طاری ہوگئی اور اس نے اس کیفیت کے زیر اثر بزرگ سے وعدہ کرلیا کہ میں یہاں ایک شہر آباد کروں گا۔

دہلی پہنچ کر بادشاہ کاروبار مملکت میں ایسا الجھا کہ یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی کچھ عرصہ بعد بادشاہ کے پیرومرشد خانقاہ اوچ شریف (ضلع بہاولپور) کے مسند نشین حضرت سید جلال الدین سرخ پوش بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی قدم رنجہ فرمایا تو بادشاہ پھولے نہیں سما رہا تھا آج اس کی خوش نصیبی اوج پر تھی کہ اس کے شیخ طریقت نے اس کی قلمرو میں قدم رکھ کر اس کی عزت بڑھائی تھی۔

حضرت سید جلال الدین سرخ پوش بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تخلیہ میں بادشاہ سے کہا کہ ''جنوبی پنجاب'' کے چھوٹے زمیندار آبیانہ کی رقم دینے دہلی آتے ہیں تو انہیں سفر میں کئی کئی روز لگ جاتے ہیں لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ اوچ شریف اور دہلی کے درمیان کوئی ایسا شہر بسایا جائے کہ ہمارے علاقوں کے لوگ وہاں آبیانہ دے جایا کریں اور تمہارے اہلکار وہاں سے دہلی پہنچا دیا کریں۔ حضرت جلال الدین سرخ پوش بخاری رحمۃ اللہ علیہ بول رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ ذہنی طور پر کہیں اور پہنچا ہوا ہے۔ حضرت نے پوچھا فیروز! کیا سوچ رہے ہو؟ بادشاہ نے گہری سوچ سے نکلتے ہوئے عرض کیا عالی جاہ مجھے بھولا ہوا ایک وعدہ یاد آگیا ہے اب میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ سرہند کے جنگلوں کو صاف کروا کر وہاں ایک شہر آباد کروں گا جس سے آپ کے ارشاد پر بھی عمل ہو جائے گا اور ایک بزرگ سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا۔

جب حضرت سید جلال الدین سرخ پوش بخاری اوچوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باصفا

حضرت رفیع الدین فاروقی کی نگرانی میں نئے شہر کی تعمیر بڑے زور و شور سے شروع ہوئی تو حضرت شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے رفیع الدین فاروقی کو خوشخبری دی کہ جس برگزیدہ بندے کے لئے یہ شہر بسایا جا رہا ہے، وہ خوش بخت تمہاری ہی نسل میں جنم لے گا۔

پھر تاریخ نے دیکھا کہ شرف الدین بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات تقدیر الٰہی بن کر جلوہ گر ہوئی اور حضرت رفیع الدین فاروقی کی ساتویں پشت میں شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں دسویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی نے آنکھ کھولی اور شاہی کارواں میں شامل اہل نظر بزرگ کی وہ بات پوری ہوئی کہ ''مجھے یہاں سے ایک برگزیدہ بندے کی خوشبو آتی ہے۔ جو یگانہ روزگار اور دین کا مجدد ہوگا''۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجدید و احیائے دین کی جو عالمگیر سیاسی تحریک چلائی تھی وہ آپ کی اولاد اور خلفاء کی حسن نیابت کی بناء پر برصغیر کے قریہ قریہ میں پہنچی اور مردہ دلوں کو نقشبندی سلوک اور توجہ سے زندہ کرتی چلی گئی۔

بارہویں صدی ہجری میں اس تحریک کی قیادت حضرت خواجہ حجۃ اللہ زبیر مجددی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ قطب الدین حیدر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۶۴ھ مدفون سرہند)، حضرت شاہ جمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۶۸ھ مدفون مدینہ طیبہ)، حضرت خواجہ عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۰۹ھ مدفون رامپور) جیسے روحانی سپوتوں کے ہاتھ میں رہی جو غلاموں کو شاہ اور محکوموں کو حاکم بناتی رہی اور اپنی للٰہیت خلوص اور زندہ جذبوں کے باعث مردہ دلوں کو زندگی کے ولولے بخشتی رہی۔ ان بزرگوں کے بے شمار قابل خلفاء نے کئی صوبوں، ریاستوں اور ملکوں میں عظیم الشان خانقاہیں قائم کر کے خانقاہی نظام کی جڑوں کو مسلمانوں کے قلوب میں ثبت فرمایا۔

تیرہویں صدی ہجری میں حضرت بابا نور محمد تیراہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۸۶ھ) مجددی فیضان کے وارث بنے۔ تیرہویں صدی کے آخر اور چودہویں صدی کے ابتدائی

سالوں میں ان کے فرزند ارجمند حضرت بابا فقیر محمد چوراہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عظیم باپ کی روحانی اور علمی وراثت کو سرحد سے پنجاب میں لائے اور اٹک کے ایک گاؤں ''چورہ شریف'' میں اپنا مرکز قائم کر کے رشد و ہدایت کی سوغات بانٹنے لگے۔ چوراہ نامی یہ گمنام گاؤں آپ کے دم قدم سے بین الاقوامی شہرت یافتہ خانقاہ میں تبدیل ہو گیا اور طریقت کے بے شمار مسافروں کے لئے نشان منزل بنا۔

آپ کی خانقاہ سے ضلع نارووال کے ایک گاؤں ''علی پور سیداں شریف'' کے دو ہمنام اور ہم وطن اور ہم عصر سید زادوں نے ۱۴ ویں صدی ہجری میں زبردست شہرت پائی۔ یہ دونوں بزرگ سید تھے۔ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ دونوں پیر بھائی تھے۔ دونوں ہمعصر تھے اور دونوں کا نام ''سید جماعت علی شاہ'' تھا۔

بڑے سید جماعت علی شاہ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوئے اور چھوٹے سید جماعت علی شاہ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے جب یہ دونوں سید زادے حضرت بابا فقیر محمد چوراہی کے پاس زیر تربیت تھے تو دونوں کے مشترک اوصاف کے باعث بعض اوقات دونوں میں امتیاز مشکل ہو جایا کرتا تھا اس لئے حضرت بابا جی نے چھوٹے سید جماعت علی شاہ کے نام کے ساتھ ''ثانی'' کا اضافہ کر دیا تا کہ دونوں میں امتیاز آسان ہو۔ اس طرح بڑے شہزادے کا نام ''سید جماعت علی شاہ'' اور چھوٹے شہزادے کا نام ''سید جماعت علی شاہ ثانی'' ہو گیا۔ جو آگے چل کر ''لاثانی'' سے تبدیل ہو گیا اور رفتہ رفتہ ''شاہ لاثانی'' ہو گیا۔

حضرت شاہ لاثانی نے خانقاہ چوراہ شریف سے جو روحانی امانت پائی تھی ساری زندگی وہ امانت امت مصطفی ﷺ کے سینوں میں منتقل کرتے رہے، وقت کے بڑے بڑے نامور علماء و مشائخ نے آپ کے دسترخوان معرفت سے خوشہ چینی کی۔ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی لکھتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک ایسا وقت تھا کہ سارے پنجاب میں حضرت لاثانی کے تصرف کا چرچا تھا''۔
(باتوں سے خوشبو آئے، مرتبہ: صلاح الدین سعیدی)

حضرت شاہ لاثانی کے چاروں بیٹے آپ کی زندگی میں ہی اللہ تبارک وتعالی کو پیارے ہو گئے تھے لہٰذا حضرت نے اپنے پوتے سید علی حسین شاہ نقش لاثانی کو اپنا جانشین بنایا اور اپنے اسلاف و مشائخ کی روحانی امانتیں انہیں سونپ کر ۱۹۳۹ء میں بہشت سدھار گئے۔

نقش لاثانی حضرت پیر سید علی حسین شاہ نے اس اہم اور بھاری ذمہ داری کو بڑے پُرخلوص جذبوں اور دن رات کی محنت سے نبھایا۔ آپ نصف صدی تک اپنے اسلاف کرام کی باطنی نعمتوں کے امین رہے اور اس نور باطن کو اگلی نسل تک منتقل کرتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں آپ نے وصال فرمایا۔

اسلاف کا نشان ہیں حضرت علی حسین
ملت کے پاسبان ہیں حضرت علی حسین

دامن میں جو بھی آیا وہ جنت میں آگیا
گویا درِ امان ہیں حضرت علی حسین

رنج و الم کی دھوپ سے دیتے ہیں وہ امان
رحمت کا سائبان ہیں حضرت علی حسین

عشاق ان کے رکھتے ہیں جذبات طیبات
کہتے ہیں میری جان ہیں حضرت علی حسین

کیا ہو سکے گی مجھ سے سعیدی بیانِ شان
ادنیٰ میں، عالی شان ہیں حضرت علی حسین

آپ کے دونورِ نظر آپ کے فیضانِ باطنی کے امین تھے۔ حضرت پیر سید عابد علی شاہ سجادہ نشین ہوئے اور حضرت پیر سید محمد اسماعیل شاہ گوشہ نشین ہو گئے۔ آپ نے گوشہ نشینی میں ہی اپنے بزرگوں کا پاکیزہ روحانی مشن جاری رکھا۔

''ماہنامہ انوار لاثانی'' کے ''نقش لاثانی ایڈیشن'' اکتوبر ۱۹۸۷ء کے اڑتیسویں صفحہ پر قدیم و جدید علوم کے ماہر، شاعر و صحافی پروفیسر محمد حسین آسی مرحوم، حضرت پیر سید محمد اسماعیل شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''خلوص و وفا کا سراپا، تسلیم و رضا کا مجسمہ، سینہ بے کینہ اور دل صدق و صفا کا خزینہ صاحبزادہ بلند اقبال پیر سید محمد اسماعیل شاہ جو اپنے والد ذیشان کے فرزند اصغر ہیں۔ سن مبارک ۲۵ کے لگ بھگ ہوگا مگر طہارت فکر و عمل میں

ع پیروں پہ اس کے عشق کا واجب ہے احترام''

آپ نے مروجہ علوم کی باقاعدہ تحصیل تو نہ فرمائی مگر آپ کے نامور باپ نے اپنے بیٹے کی ایسے خطوط پر تربیت فرمائی تھی کہ آپ کسی دنیاوی ڈگری اور سند کے محتاج نہ رہے اس سلسلے میں رعایت لفظی سے کہا جا سکتا ہے کہ:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے ''اسماعیل'' کو آدابِ فرزندی

یقیناً یہ حضرت شیخ طریقت نقش لاثانی کی نظر کا فیضان ہی تھا جس نے حضرت پیر سید محمد اسماعیل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو آدابِ فرزندی سکھائے۔ حضرت نقش لاثانی سرکار آپ کو اپنے ساتھ دوسری مرتبہ حج و زیارت کو لے گئے اور آپ کو ''ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر'' کے پاکیزہ ماحول میں سنہری جالیوں کے سامنے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں داخل کر کے اس مقدس لڑی میں پرویا جس کا دوسرا سرا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ کل قیامت کے دن اس حسین مالا کو بارگاہ رسالت میں پیش کرنے والے ہیں۔

حضرت پیر سید محمد اسماعیل شاہ کو آپ کے والد گرامی حضرت نقش لاثانی نے بیعت کرنے کے بعد روحانی توجہات سے خوب نوازا جس کے اثرات آپ کی تمام زندگی پر محیط اور حیات مستعار کے آخری لمحوں تک جاری و ساری رہے۔

آپ تصوف کے اصول اخفاء پر کاربند تھے جو بھی کام کرتے اس میں للّٰہیت کا اہتمام کرتے، کوئی جلسہ کرواتے تو اشتہار نہ چھپواتے، حج و زیارت کو جاتے تو پبلسٹی کو پسند نہ فرماتے، کسی دینی جماعت یا ادارے کو مالی امداد دیتے تو پہلے یہ منوا لیتے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ آپ تمام عمر انہیں سنہرے اصولوں پر گامزن رہ کر بارگاہ ایزدی میں سرخرو ہو گئے۔ رب کریم سے دعا ہے کہ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔

ماہ سے زیادہ درخشاں پیر سید اسماعیل
مہر سے بڑھ کر فروزاں پیر سید اسماعیل

مستفیضِ شاہِ خوباں پیر سید اسماعیل
محفلِ خوباں میں تاباں پیر سید اسماعیل

ظلمتیں تم سے گریزاں پیر سید اسماعیل
کیونکہ ہو صادق بداماں پیر سید اسماعیل

وارثِ محبوبِ یزداں پیر سید اسماعیل
قاسمِ فیضِ فراواں پیر سید اسماعیل

فقر کی دولت پہ نازاں پیر سید اسماعیل
غم میں بھی شاداں و فرحاں پیر سید اسماعیل

شاہسوار راہِ عرفاں پیر سید اسماعیل
بلکہ میرِ کارواں آں پیر سید اسماعیل

مرتجائے خالی دستاں پیر سید اسماعیل
اے سعیدی شاہِ شاہاں پیر سید اسماعیل

راقم کو آپ کے جانشین حضرت مولانا حافظ سید کرامت علی حسین شاہ سے ایک بار ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا جب وہ ''بیبیاں پاک دامن'' کے بارے میں میرا ایک تحقیقی مضمون پڑھ کر خوش ہوئے اور خوشی کی اس کیفیت میں مجھے ملاقات سے نوازا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ''ماہنامہ النعیمیہ'' لاہور میں اعزازی طور پر ادارتی ذمہ داری نباہ رہا تھا۔

اس مختصر ملاقات میں حضرت کی شخصی وضع داری اور خاندانی شرافت و نجابت نے مجھے بڑا متاثر کیا اور خاص طور پر اس بات نے بڑی مسرت کا سامان پیدا کیا کہ آپ علوم اسلامیہ کے حصول کے لئے گھر بار چھوڑ کر لاہور آئے ہوئے ہیں۔ اس گئے گزرے دور میں جب کہ بڑے بڑے دینی خانوادوں کے چشم و چراغ بھی دینی تعلیم سے ہچکچا رہے ہیں حضرت کا یہ مبارک عمل یقیناً تمام پیرزادوں کے لئے تقلید کے لائق ہے۔ میری دعا ہے کہ مولائے کریم سید کرامت علی حسین شاہ کو اسم بامسمّٰی بنائے اور آپ کے وجود سے نہ صرف روحانی قدریں زندہ ہوں بلکہ علوم و معارف کے دیپ بھی جلیں تاکہ مستقبل میں ہماری نئی نسل کو گمراہ فرقوں کا یہ طعنہ نہ سننا پڑے کہ ''سنیوں کے پیرزادے اور صاحب زادے جاہل ہوتے ہیں''۔



تیسرا باب

برصغیر کی شخصیات

امام احمد رضا کے کلام میں
صنعتِ تضاد کا مختصر مطالعہ

''صنعتِ تضاد'' شاعری کی ایک دلچسپ صنعت ہے۔ صنعت تضاد کی تعریف یہ ہے کہ شعر کے پہلے مصرعہ میں ایک ایسا لفظ استعمال کیا جائے کہ جس کی ضد دوسری مصرعہ میں بیان ہو مثلاً پہلے مصرعہ میں اگر شمع کا ذکر ہو تو دوسرے میں پروانے کا ذکر لا کر حسن تضاد پیدا کیا جائے۔ پہلے مصرع میں اگر دن کا ذکر کیا گیا ہو تو دوسرے مصرعہ میں رات کا لفظ استعمال کر کے فنی خوبی پیدا کی جائے۔ یعنی متضاد معنوی حیثیت کے دو الفاظ کو بالترتیب شعر کے دو مصرعوں میں استعمال کرنے کی فنی اصطلاح میں ''صنعت تضاد'' کہتے ہیں۔ مثلاً پیرزادہ عبدالحمید صابری کا ایک شعر ہے۔

اُن کی آمد ہوئی ''زحمتِ'' قبر میں
مرجع ''رحمتِ'' حق لحد ہو گی

زحمت اور رحمت دو متضاد کیفیتیں ہیں جنہیں ایک دوسرے کے مقابل لا کر فنی حُسن کا اظہار کیا گیا ہے۔

سلطان محمود اپنے ایک شعر میں صنعت تضاد کو یوں بروئے کار لائے ہیں۔

دوستوں کی بھی بھلائی آپ کو منظور تھی
دشمنوں کے واسطے بھی عمر بھر اچھا کیا

دوستوں اور دشمنوں کے الفاظ دو مصرعوں میں آمنے سامنے کتنا لطف پیدا کر رہے ہیں۔

حضرت سید خلیل احمد خاکی محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

حدِ ملکوتی پہ رہے ''سارے'' فرشتے
رکنے نہیں دیتی انہیں ''وحدت'' سب معراج

پہلے مصرعے میں ''سارے'' اور دوسرے مصرعے میں ''وحدت'' لا کر صنعت تضاد کا خوبصورت اظہار کیا گیا ہے۔

اسی نعت کا ایک اور شعر ہے۔

دنیا میں تو خاکی شب غفلت سے ہے محجوب
کھل جائے گی کل روز قیامت شب معراج

اس شعر میں ''شب'' اور ''روز'' کو بطور صنعتِ تضاد لایا گیا ہے۔

ذیل میں کوٹلی لوہاراں والے بزرگ حضرت مولانا محمد بشیر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خوبصورت شعر ہے۔ جس میں ''تلخیاں'' اور ''مٹھائی'' کو تضاد کی صنعت کے طور پر حضرت مولانا نے بڑی مہارت فنی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

دور ہو جائیں گی تیری ''تلخیاں''
کھا ''مٹھائی'' محفلِ میلاد کی

حضرت مولانا حسن رضا بریلوی فرماتے ہیں۔

''چڑھی'' ہے اوج پہ تقدیر خاکساروں کی
خدا نے جب سے ''اتاری'' ہے بارہویں تاریخ

صنعتِ تضاد میں راقم کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سایہ بڑھتا ''آ رہا'' ہے آپ کے جانے کے بعد
نور سمٹا ''جا رہا'' ہے آپ کے جانے کے بعد

حضرت امام احمد رضا نے جس طرح دیگر اصناف سخن اور فنون لطیفہ میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اس طرح ''صنعت تضاد'' میں بھی بڑی کامیابی سے قدم رکھا ہے۔

اسی مختصر تحریر میں قارئین کی ضیافت طبع کے لئے امام احمد رضا کے کلام میں

صنعت تضاد کا مختصر مطالعہ پیش خدمت ہے۔ جس کا مقصد یہ بھی ہے کہ امام موصوف پر تحقیقی کام کرنے والے سکالرز اس پہلو پر بھی امام احمد رضا کے کام کو روشناس کروائیں۔

(۱) بزمِ آخر کا شمع فروزاں ہوا
نورِ اول کا جلوہ ہمارا نبی ﷺ

دیکھئے پہلے مصرعہ میں لفظ ''آخر'' استعمال ہوا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں دوسرے مصرعہ میں لفظ ''اول'' لاکر حسن تضاد پیدا کیا ہے۔

(۲) حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں تیرے نام پہ مردانِ عرب

ملاحظہ فرمائیں پہلے مصرعہ میں مصر کی عورتوں کا ذکر ہے۔ اور اس بات کا متقاضی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں اس کا مقابل مذکور ہو چونکہ مصر کی عورتیں حسن و نزاکت میں مشہور ہیں اور عرب کے مرد وجاہت کے لئے مشہور ہیں لہٰذا زنانِ مصر کی ضد کے طور پر ''مردانِ عرب'' کے الفاظ دوسرے مصرعہ میں لاکر فنی حسن پیدا کیا گیا ہے۔

(۳) ہشت خلد آئیں وہاں کسبِ لطافت کو رضا
چار دن برسے جہاں ابرِ بہارانِ عرب

پہلے مصرعہ میں ہشت یعنی آٹھ کا عدد مذکور ہوا ہے۔ تو اب اس کے مقابلے میں دوسرے مصرعہ میں ۴ کا عدد لایا ہے اور آٹھ اور چار سے جو حسن پیدا کیا ہے وہ امام احمد رضا ہی کا حصہ ہے۔

(۴) زینتِ کعبہ میں ہے لاکھ عروسوں کا بناؤ
جلوہ فرما یہاں کونین کا دولہا دیکھو

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ میں عروس یعنی دلھن کا ذکر ہے اور مصرعہ ثانی میں ''دولہا'' کا لفظ ''دلہن'' کے مقابلے میں مستعمل ہوا۔

(۵) یاالٰہی بھول جاؤں نزع کی تکلیف کو
شادیٔ دیدارِ حسنِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو

نزع کی تکلیف سب سے بڑی تکلیف ہے اور حضور ﷺ کے دیدار کی خوشی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس لئے پہلے مصرعہ میں نزع کی تکلیف کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کی ضد کے طور پر دیدارِ حسن مصطفیٰ کی خوشی کا بیان ہے۔

(۶) یا الٰہی گورِ تیرہ کی جب آئے سخت رات
ان کے پیارے منہ کی صبحِ جانفزا کا ساتھ ہو

قبر کی اندھیری رات ضرب المثل ہے اور اعلیٰ حضرت نے اس اندھیری رات کے مقابلے میں حضور ﷺ کے رخِ انور کو ''صبحِ جانفزا'' کہہ کر شعر کو صنعتِ تضاد کا شاہکار بنا دیا۔

(۷) یاالٰہی جب پڑے محشر میں شورِ داروگیر
امن دینے والے پیارے پیشوا کا ساتھ ہو

محشر کے شور اور نفسی نفسی کا ذکر تو اکثر شاعر کیا کرتے ہیں لیکن امام احمد رضا کی فنی مہارت دیکھئے کہ ''شورِ محشر'' کے مقابلے میں ''امن'' کتنی کامیابی سے حضور ﷺ کے دامن میں تلاش کیا ہے۔

(۸) یاالٰہی جب زبانیں باہر آئیں پیاس سے
ساقیٔ کوثر شہِ جود و عطا کا ساتھ ہو

عام طور پر پیاس کی ضد پانی ہوتا ہے لیکن مذکورہ بالا شعر کے مصرعہ اولیٰ میں چونکہ محشر کی پیاس مذکور ہے اس لئے مصرعہ ثانی میں ''پیاس'' کی ضد پانی ہیں۔ بلکہ خود حضور ساقیٔ کوثر ﷺ کی ذات مبارکہ مذکور ہے۔

(۹) یاالٰہی گرمیٔ محشر میں جب بھڑکیں بدن
دامنِ محبوب کی ٹھنڈی ہوا کا ساتھ ہو

’’گرمی‘‘ اور’’ٹھنڈی ہوا‘‘ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر عام گرمی مراد ہوتو اس کی ضد بھی عام ٹھنڈی ہوا ہوگی جب گرمی محشر مراد ہوتو اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوب ﷺ کے دامن کی ٹھنڈی ہوا اس کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ لہٰذا شاعر موصوف نے ’’گرمی محشر‘‘ کے سامنے ’’دامن محبوب کی ٹھنڈی ہوا‘‘ کے مناسب ترین الفاظ لاکر صنعت تضاد کا حق ادا کردیا ہے۔

(۱۰) قسمت میں لاکھ پیچ ہوں، سوبل، ہزار کج
یہ ساری گتھی اک تری سیدھی نظر کی ہے

مصرعہ اولیٰ میں ’’لاکھ پیچ سوبل ہزار کج‘‘ مستعمل ہیں اور ثانی میں ان کی ضد کے لئے ’’اک سیدھی نظر‘‘ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس شعر میں ایک اور فنی لطافت بھی پائی جاتی ہے کہ ’’پیچ بل اور کج‘‘ کے مقابلے میں ’’سیدھی نظر‘‘ ہے اور ’’لاکھ سو ہزار‘‘ کے مقابلے میں ’’اک‘‘ مذکور ہے۔

(۱۱) بیٹھوں جو در پاک پیمبر کے حضور
ایمان پہ اس وقت اٹھانا مرے مولا

پہلے مصرعہ میں بیٹھنے کا ذکر ہے اور دوسرے میں اٹھانے کا ذکر کر کے خوبصورتی پیدا کی گئی ہے۔

(۱۲) نامہ سے رضا کے اب مٹ جاؤ ’’بُرے کامو‘‘
دیکھو مرے پلے پروہ ’’اچھے میاں‘‘ آیا

مصرعہ اولیٰ میں ’’بُرے کامو‘‘ کے الفاظ تھے۔ اس لئے مصرعہ ثانی میں اپنے پیر ومرشد حضرت اچھے میاں رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا اور لفظ ’’اچھے‘‘ کی روایت سے وہ معنویت پیدا کی کہ کیا کہنے۔ یعنی دیکھو میرے پلے پر حضرت اچھے میاں آگئے ہیں تو اے بُرے کامو میرے نامہ اعمال سے مٹ جاؤ کیونکہ ’’اچھے‘‘ اور ’’بُرے‘‘ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۱۳) تیری دوزخ سے تو کچھ چھینا نہیں
خلد میں پہنچا رضا پھر تجھ کو کیا

دوزخ اور خلد ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس شعر میں ان دونوں کو دو مصرعوں میں آمنے سامنے لاکر اعلیٰ حضرت نے خوب لطف پیدا کیا ہے۔

(۱۴) صدقے رحمت کے کہاں پھول کہاں خار کا کام
خود ہے دامن کشِ بلبل گُلِ خندانِ عرب

اس شعر میں پھول اور بلبل کو صنعت تضاد کا رنگ دیکر قارئین اور سامعین کے ذوق کی ضیافت کا سامان کیا ہے۔

(۱۵) ناریوں کا دور تھا دل جل رہا تھا نور کا
تم کو دیکھا ہو گیا ٹھنڈا کلیجہ نور کا

’’جل رہا‘‘ اور ’’ٹھنڈا‘‘ میں بھی یہی تضاد کا حسن کارفرما ہے۔

(۱۶) فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اُڑتا ہے پھریرا تیرا

(۱۷) عرش پر دھومیں مچیں وہ مومن و صالح ملا
فرش سے ماتم اٹھے وہ طیب و طاہر گیا

اوپر کے دونوں شعروں میں ’’عرش‘‘ اور ’’فرش‘‘ کے لفظوں میں صنعت تضاد کی جھلک نظر آتی ہے۔

(۱۸) ہلکا ہے اگر ہمارا پلہ
بھاری ہے تیرا وقار آقا

ہلکا اور بھاری کو ملاحظہ فرمائیے اور شاعر کے فن اور ذوق کی داد دیجئے۔

(۱۹) صبح کر دی کفر کی سچا تھا مژدہ نور کا
شام ہی سے تھا شب تیرہ کو دھڑکا نور کا

صبح اور شام کے لفظوں میں جو خوبی نظر آرہی ہیں یہ بھی اہل ذوق کی داد و تحسین کی بجا طور پر مستحق ہے۔

(۲۰) ''دشت'' حرم ہے جانِ دلہن گو دلہن نہیں
رشکِ ارم ہے گرچہ بظاہر ''چمن'' نہیں

دشت اور چمن متضاد مفہوم رکھنے والے دو لفظ ہیں۔ جنہیں ۲ مصرعوں میں سمو کر فنی حسن کا سامان کیا گیا ہے۔

(۲۱) یکتا ریاضِ دہر میں اس گل کی ذات ہے
بلبل ہزار بات کی یہ ایک بار ہے

اس شعر میں گل اور بلبل بھی متضاد الفاظ ہیں اور ''یکتا'' اور ''ہزار'' بھی متضاد مفہوم رکھتے ہیں۔

(۲۲) خدارا مرہم خاک قدم دے
جگر زخمی ہے دل گھائل ہے یا غوث

''مرہم'' اور ''زخمی'' بھی خوب داد کا مستحق ہے۔

امام احمد رضا کے کلام میں صنعت تضاد کا یہ ایک مختصر مطالعہ ہے اس طرح آپ کے کلام میں بے شمار علمی اور فنی محاسن پوشیدہ ہیں بس تحقیق کی ضرورت ہے۔



علامہ اقبال کا نظریہ ختم نبوت

اللہ پاک نے بندوں کی ہدایت کے لئے نبوت و رسالت کا جو نظام قائم کیا تھا وہ اپنے اہداف کو پورا کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا تمام انبیاء کرام اپنے اپنے عہد میں نبوت و رسالت کے تقاضے پورے کرتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس عظیم الشان سلسلہ کی تکمیل ہوئی اور آپ کے بعد نبوت و رسالت کا یہ مبارک سلسلہ ختم ہوا۔ اب اگر کوئی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرے وہ کافر قرار پائے گا۔ کیونکہ اب دنیا کی وسعتیں سمٹ رہی ہیں کہ لہذا نظام فطرت کے تحت اور انسانی معاشرے کی ضرورتوں کے عین مطابق نبوت و رسالت کے تمام کمالات اور تقاضے سمیٹ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ دنیا کو ایک وحدت میں پرونے کے لئے شریعت محمدی کو آخری اور حتمی شکل دے کر وحی کے سلسلے کو بند کر دیا گیا ہے۔ اہل اسلام کے اس متفقہ نظریے کو نظریہ ختم نبوت کہا جاتا ہے۔

علامہ اقبال پہلے مجتہد ہیں جنہوں نے ختم نبوت کو اجتہاد کی اساس قرار دیا ہے۔ نبوت ختم ہوگئی ہے اور اجتہاد شروع ہوگیا ہے۔ علامہ اقبال کی یہ رائے تاریخ مذاہب عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ وہ اپنے انگریزی خطبات کے باب ''مسلم ثقافت کی روح'' کے صفحہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں۔

Looking at the matter from this point of view then, the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so fat as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life

discovers other sources of Knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as i hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. in Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be keptin leading strings; that inorder to achieve full self-conciousness man must finally be thrown back on his own resources. the abolition of reiesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the dmphsis that it lays on Nature and History as sources of human Knoeledge, are all different aspects of the same idea of finality.

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیت، دنیائے قدیم اور زمانہ جدید کے درمیان ایک واسطے کی ہے۔ اپنے سرچشمہ وحی کے اعتبار سے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن اپنی وحی کی روح کے اعتبار سے آپ کا تعلق زمانہ جدید سے ہے۔ آپ کے وجود سے حیاتِ انسانی پر علم و حکمت کے وہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔ اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طور پر ثابت کر دیا جائے گا استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنے ختم کے انکشاف سے اپنے معراج کو پہنچتی ہے۔ اس سے یہ گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ حیاتِ انسانی کو ہمیشہ بچے کی طرح ڈوری کے ذریعے چلنا سیکھنے کی کیفیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ مکمل شعور کے حصول کے لئے انسان کو بالآخر اپنے انسانی وسائل علم پر انحصار کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور موروثی

ملوکیت کو ختم کر دیا ہے۔ قرآن میں بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا گیا ہے۔ عالم فطرت اور عالم تاریخ انسانی ذرائع علم قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تمام ذرائع علم ختم نبوت کے مختلف پہلو ہیں۔

علامہ اقبال کے اس اجتہاد سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

اوّل: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قدیم اور زمانہ جدید کے درمیان واسطہ ہیں۔ آپ کی وحی کا تعلق سرچشمہ کے اعتبار سے زمانہ قدیم سے ہے، جبکہ اس کی روح کا تعلق دورِ جدید سے ہے۔

دوم: ظہورِ اسلام، دراصل استقرائی عقل کے ظہور کا نام ہے۔

سوم: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے علم و حکمت کے ایسے چشمے جاری ہوئے جو نئے دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

چہارم: نبوت اپنے ختم کے انکشاف سے اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے۔

پنجم: حیاتِ انسانی بلوغت کو پہنچ کر آئندہ نبوت کی محتاج نہیں رہی۔ وہ اپنے وسائل علمی سے خود انحصار حاصل کر چکی ہے۔

ششم: ختم نبوت اعلانِ عام ہے۔ ختم مذہبی پیشوائیت اور ختم موروثی ملوکیت۔

ہفتم: ختم مذہبی پیشوائیت، ختم ملوکیت، عقلی و تجرباتی علوم پر زور، فطرت اور تاریخی ذرائع علم پر انحصار، عقیدۂ ختم نبوت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ختم نبوت پر ایمان، ان ذرائع علم پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔

ہشتم: ختم مذہبی پیشوائیت اور ختم موروثی ملوکیت کا انکار، عقیدۂ ختم نبوت کا انکار ہے۔

نہم: عقلی و تجرباتی علوم پر زور کا انکار اور فطرت اور تاریخ کے ذرائع علم پر انحصار کا انکار، عقیدۂ ختم نبوت کا انکار ہے۔

بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمع عرفاں کردہ ای

مذکورہ بالا فارسی شعر میں کہتے ہیں "یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم آپ کے بعد نبوت ہر مفہوم میں شرک ہے، آپ نے عرفان حق کی شمع سے بزم کائنات کو روشن فرما دیا ہے لہٰذا اب کسی

نبی کی ضرورت نہیں رہی''۔ اقبال کے فارسی کلام میں جا بجا نظریہ ختم نبوت پر عمدہ اشعار ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری نہ صرف شعری ذوق کی تسکین حاصل کرتا ہے بلکہ بے شمار فکری گتھیاں بھی سلجھا لیتا ہے۔ آگے چل کر ہم مزید اشعار سے قارئین کی ضیافت کریں گے لیکن پہلے علامہ اقبال کے نثری کلام کے مطالعہ سے اقبال کی نظریہ ختم نبوت سے وابستگی اور قادیانیت کی تردید و تغلیط کے ضمن میں اُن کی علمی خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

عام طور پر ہم علامہ اقبال کو شاعر کے روپ میں ہی دیکھتے ہیں نثر نگار اقبال کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں پڑھتے حالانکہ اقبال کے تحقیقی نثر پارے اتنے جاندار اور شاندار ہیں کہ قوم کی فکری تربیت کے اہم تقاضے پورے کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے مختلف مقالات، مضامین، خطبوں اور خطوط میں بڑے عمدہ اور مؤثر پیرائے میں رد قادیانیت کا فریضہ ادا کیا ہے آیئے کچھ اقتباسات دیکھتے ہیں جن سے پتا چلے گا کہ اقبال نظریہ ختم نبوت کے کتنے بڑے پرچارک تھے۔

(۱) پنڈت جواہر لعل نہرو کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

۲۱ جون ۱۹۳۵ء، لاہور

میرے محترم پنڈت جواہر لعل!

آپ نے خط بھیجا جو مجھے کل ملا بہت بہت شکریہ جب میں نے آپ کے مقالات کا جواب لکھا تب مجھے اس بات کا یقین تھا کہ احمدیوں کی سیاسی روش کا آپ کو بخوبی اندازہ نہیں ہے۔ دراصل جس خیال نے خاص طور پر مجھے آپ کے مقالات کا جواب لکھنے پر آمادہ کیا وہ یہ تھا کہ میں دکھاؤں علی الخصوص آپ کو کہ مسلمانوں کی یہ وفاداری کیونکر پیدا ہوئی اور بالآخر کیوں کر اس نے اپنے لیے احمدیت میں ایک الہامی بنیاد پائی۔ جب میرا مقالہ شائع ہو چکا تو بڑی حیرت سے معلوم ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان اسباب کا تصور نہیں جنہوں نے قادیانیت کو ایک خاص قالب میں ڈھالا۔ مزید برآں پنجاب اور دوسری جگہوں پر آپ کے مقالات پڑھ کر آپ کے مسلمان عقیدتمندوں کو یہ گمان گزرا کہ احمدی تحریک سے آپ کو ہمدردی ہے اور یہ اس سبب سے ہوا کہ آپ کے مقالات سے احمدیوں میں مسرت وانبساط کی ایک لہری دوڑادی آپ کی نسبت اس غلط فہمی کے پھیلانے کا ذمہ دار بڑی حد تک احمدی پریس تھا۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ میرا تاثر غلط ثابت

ہوا۔ مجھ کو خود ''دینیات'' سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے مگر احمدیوں سے خود انہی کے دائرہ فکر میں نپٹنے کی غرض سے مجھے بھی ''دینیات'' سے کسی قدر جی بہلانا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یہ مقالہ اسلام اور ہندوستان کے ساتھ بہترین نیتوں اور نیک ترین ارادوں میں ڈوب کر لکھا۔ میں اس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ یہ احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

لاہور میں آپ سے ملنے کا جو موقع میں نے کھویا، اس کا سخت افسوس ہے۔ میں ان دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ مسلسل اور پیہم علالت کے سبب میں عملاً عزلت گزیں ہوں اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ مجھے ضرور مطلع فرمائیں کہ آپ پھر کب پنجاب تشریف لا رہے ہیں؟ شہری آزادیوں کی انجمن کے بارے میں آپ کی جو تجویز ہے اس سے متعلق میرا خط آپ کو ملا یا نہیں؟ چونکہ آپ اپنے خط میں اس خط کی رسید نہیں لکھتے، اس لئے مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ یہ خط آپ کو ملا ہی نہیں۔

آپ کا مخلص: محمد اقبال

(کچھ پرانے خط حصہ اول، مرتبہ جواہر لعل نہرو، مترجمہ عبدالمجید الحریری) تشکیل جدید الٰہیات علامہ اقبال کی مشہور کتاب ہے جس میں اقبال نے خطبات شامل ہیں آیئے۔ ایک اقتباس پڑھتے ہیں۔

ختم نبوت اسلام کا ایک نہایت لازم اور بنیادی تصور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور کی ذات کی تکمیل ہو گی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کا جائز نہیں رکھا، یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لئے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے یہ سب تصورات خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا یہ عقیدہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا

کہ اس سے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق سرچشمہ سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعووں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ (پانچواں خطبہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، صفحہ ۹۵۔۱۹۳)

حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ کے خلیفہ، مولانا پروفیسر محمد الیاس برنی علامہ اقبال کے قلمی دوستوں میں سے تھے آپ کی کتاب ''قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'' ختم نبوت کے مناظرانہ ادب میں کلیدی اہمیت کی کتاب ہے اس میں پروفیسر برنی کی وہ تقریریں شامل ہیں جو آپ عید میلاد النبی کے جلسوں میں کیا کرتے تھے اور ان میں قادیانیوں کا رد کیا کرتے تھے یہ کتاب پاک و ہند میں کئی اداروں کی طرف سے چھپ چکی ہے پروفیسر محمد الیاس برنی کے نام اپنے ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں۔

''جہاں تک مجھے معلوم ہے بروز کا مسئلہ **مجوسی** مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی ہے''۔ (پروفیسر محمد الیاس برنی کے نام مکتوب)۔ ۲۷ مئی ۱۹۳۷ء

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حسین احمد مدنی نے کانگریس کے زیر اثر ایک سیاسی نظریہ پیش کیا کہ قومیں نظریات سے نہیں وطن سے بنتی ہیں۔ علامہ اقبال نے اس سیاسی اور فکری گمراہی پر حسین احمد مدنی کا بہت مہذب انداز میں قلمی تعاقب کیا۔ اس مسئلہ کا تفصیلی ذکر ماہر اقبالیات سید نور محمد قادری نے اپنی کتاب ''اقبال کا آخری معرکہ'' میں کیا ہے اس سلسلہ میں اقبال کے اشعار بہت مشہور و مقبول ہیں۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ''ملت از وطن است''
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

حسین احمد مدنی کو سرزنش کرتے ہوئے اقبال نے انکے نظریہ وطنیت وقومیت کو ''قادیانی افکار کا تتبع'' قرار دیا اور اُن کو لکھا۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور انکار خاتمیت النبیات کا مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے، جس کی توضیح اس وقت ہوگی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ، ہندی، مسلمانوں بالخصوص ان کے بعض بظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں ۹ مارچ ۱۹۳۸ء)

اپنے اسی خط میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کے اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس سے نبوت محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ ملتی ہے''۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں)

یہ تو تھا اقبال کے نثری ذخیرے میں سے کچھ نمونہ کلام اور اب قارئین کی خدمت میں اقبال کے اشعار پیش ہیں۔

جب مرزا قادیانی نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا علامہ اقبال نے مرزا کی مہدویت کی قلعی کھولتے ہوئے ضرب کلیم کے صفحہ ۶۵ پر فرمایا۔

دنیا کو ہے اُس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

جب مرزا غلام احمد نے قرآن کی من مانی تاویلات شروع کیں تو اقبال نے مرزا کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے اس کتاب میں فرمایا۔

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

آخر جب مرزا نے نبوت کا دعویٰ کر ڈالا تو ختم نبوت کی ایمان آفریں تشریح کرتے ہوئے حضرت اقبال کا خوبصورت اور دوٹوک انداز ملاحظہ کیجئے۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد

ترجمہ: بس اللہ تعالیٰ نے ہمارے پر شریعت ختم کردی ہے اور ہمارے رسول پر رسالت ختم کردی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں

رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم ما اقوام را

ترجمہ: ہمارے رسول رسولوں میں آخری ہیں اور ہم آخری قوم ہیں اب قیامت تک محفل ایام کی رونق ہمیں سے ہے۔

ایک شعر میں حدیث پاک کے الفاظ ''لانبی بعدی'' کا بڑے پیارے انداز میں پیوند لگایا ہے۔

لانبی بعدی ز احسان خدا است
پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است

ترجمہ:

جب مرزا نے اپنے آپ کو قرآن کی آیات مقدسہ کا مصداق ٹھہرانا شروع کیا تو ایک بار پھر اقبال کا غیور قلم حرکت میں آیا

عصر من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآن بغیر از خود ندید

ہمارے زمانے (انگریزی عہد) کے نزدیک ایسا پیغمبر پیدا کر ڈالا ہے جسے قرآن میں اپنے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ آخر میں علامہ اقبال کا ختم نبوت کے موضوع پر ایک اردو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

مرزا، مرزائی اور مرزائیت

مسلم مشاہیر کی نظر میں

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کوٹ مٹھن شریف

''مرزا قادیانی کافر ہے۔ قادیانی فرقہ ناری اور جہنمی ہے۔ حضور اکرم ﷺ پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ حضور کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا'' [1]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ

''قادیانی مرتد، منافق ہیں۔ مرتد منافق وہ کہ کلمہ، اسلام اب بھی پڑھتا ہے، اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے اور پھر اللہ عزوجل یا رسول اللہ ﷺ یا کسی نبی کی توہین کرتا ہو یا ضروریات دین میں سے کسی شے کا منکر ہے۔ اس کا ذبیحہ محض نجس، مردار، حرام قطعی ہے۔ مسلمانوں کے بائیکاٹ کے سبب قادیانی کو مظلوم سمجھنے والا اور اس سے میل جول چھوڑنے کو ظلم و ناحق سمجھنے والا اسلام سے خارج ہے اور جو کافر کو کافر نہ کہے، وہ بھی کافر'' [2]

حضرت میاں شیر محمد شرقپوری علیہ الرحمۃ

''حضرت میاں شیر محمد شرقپوری نے ایک دفعہ مراقبہ کیا اور دیکھا کہ مرزا قادیانی کی شکل قبر میں باؤلے کتے کی طرح ہے اور باؤلے پن کا اس پر دورہ پڑا ہوا ہے۔ اس کا منہ دم کی طرف ہے، بھونک رہا ہے اور گول چکر کاٹ رہا ہے، منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور بار بار اپنی دم اور ٹانگوں کو کاٹتا ہے'' [3]

حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی علیہ الرحمۃ:

''حجاز کے مبارک سفر میں مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ سے ملاقات ہوئی جو ایک صحیح صاحب کشف انسان تھے۔ جب ان کو میری آزاد اور بے باک طبیعت کا علم ہوا تو شدید اصرار اور تاکید سے فرمایا کہ چونکہ عنقریب ہندوستان میں ایک فتنہ ظاہر ہونے والا ہے لہٰذا تم وطن واپس چلے جاؤ۔ اگر بالفرض تم خاموش بھی رہو گے تو بھی یہ فتنہ ترقی نہ کر سکے گا اور اس طرح ملک میں آرام رہے گا۔ چنانچہ میں پورے وثوق کے ساتھ حاجی صاحب کے اس کشف کو مرزا قادیانی کے فتنہ سے تعبیر کرتا ہوں۔

حضور ﷺ نے بھی خواب میں مجھے حکم دیا کہ یہ مرزا قادیانی غلط تاویل کی قینچی سے میری احادیث کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا اور ہے تو خاموش ہے'' ۔۴

حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی علیہ الرحمۃ:

''جو شخص اسلام چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے تو وہ کافر ہے، مرتد ہے اور مرتد کی سزا شریعت میں قتل ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں حکومت ہوتی تو میں قادیانیوں کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرتا، جس کی نظیر سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قائم کی تھی۔ مرزائیوں کا سوشل بائیکاٹ بالکل جائز ہے۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا میل جول ختم کر دیا جائے'' ۔۵

حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ:

''میں اس باب میں کوئی شک و شبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ یہ احمدی (مرزائی) اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں'' ۔۶

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ:

جب کشمیر سے واپسی پر قائداعظم سے سوال کیا گیا کہ آپ کی قادیانیوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''میری رائے وہی ہے جو علماء کرام اور پوری امت کی

ہے'' ۔

قائد تحریک ختم نبوت 1974ء مولانا شاہ احمد نورانی علیہ الرحمۃ:

''مرزائیت، یہودیت کی گود میں پروان چڑھ رہی ہے اور پاکستان میں ''تل ابیب'' کا ایجنٹ ''ربوہ'' ہے۔ اس کی معرفت جو چاہتے ہیں کرواتے ہیں۔ مذہب کا تو ان لوگوں نے لبادہ اوڑھ رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی خطرناک سیاسی تحریک ہے اور یہ صیہونیت کی ایک ذیلی تنظیم ہے جو مسلمانوں کے اندر رہ کر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کر رہی ہے'' ۔۸

مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں نیازی علیہ الرحمۃ:

پھانسی کی سزا پانے والے مجاہد تحریک ختم نبوت

مرزائی جہاں کہیں بھی موجود ہے، کفر کا ایجنٹ ہے۔ اسلام کے خلاف جاسوس ہے۔ مرزا قادیانی نے خود کہا ہے کہ ''میں انگریز کا خود کاشتہ پودا ہوں اور انگریز کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے''۔ مزید کہا کہ ''انگریز کے دور میں ہمیں وہ امن و امان نصیب ہوا ہے جو ہمیں مکے اور مدینے میں بھی نہیں مل سکتا''۔ قادیانیوں نے سقوط ڈھاکہ کے موقع پر گھی کے چراغ جلائے تھے۔۹

پاسبان مسلک رضا عالم باعمل مولانا ابوداؤد محمد صادق:

مرزا قادیانی کے متعلق یاد رکھیے کہ وہ صرف ختم نبوت کے انکار ہی کی وجہ سے مرتد نہیں بلکہ اس ذلیل کفر کے علاوہ بھی اس کے اور بیسوں کفریات ہیں۔ لہٰذا مرزا قادیانی اور کسی مدعی نبوت کو نبی ماننا، اپنا امام و پیشوا جاننا تو درکنار، ایسوں کو ادنیٰ مومن سمجھنا اور ان کے کفر میں شک کرنا بھی اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔۱۰

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

خصوصاً آج کل کے انبیاء سے

مجاہد تحریک ختم نبوت حضرت صوفی محمد ایاز خان نیازی (کراچی)

امیر اول تحریک فدایان ختم نبوت پاکستان

۱۹۴۸ء میں جب جہاد آزادیٔ کشمیر کا آغاز ہوا اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو ڈوگرہ سامراج سے آزاد کرانے کیلئے پورے ملک سے عوام بالخصوص صوبہ سرحد سے قبائل نے کشمیر کا رخ کیا تو حضرت صوفی محمد ایاز خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ بھی میانوالی سے مجاہدین کے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے کشمیر پہنچے۔ مشہور مسلم لیگی رہنما امیر عبداللہ خان روکڑی اس لشکر میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہم ایک دن میں جتنا پیدل سفر کر سکتے تھے اتنا ہی علاقہ فتح کر لیتے تھے۔ ہماری آمد کی اطلاع سن کر ڈوگرہ فوج اور ہندو مہاشے علاقہ چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ آپ بڑے افسوس کا اظہار کرتے کہ ہم نے جو جنگ میدان میں جیتی اسے مذاکرات کی میز پر ہار دیا گیا اگر ہمیں چند دن اور مل جاتے اور فائر بندی کا اعلان نہ ہوتا تو ہم پورا کشمیر فتح کر لیتے۔ ہم ہندو اور قادیانی کی سازش کا شکار ہو گئے۔ ہندو سے آپ کی مراد جواہر لعل نہرو اور قادیانی سے مراد سر ظفر اللہ خان تھے۔

آپ کہتے تھے کہ پاک فوج کی طرف سے جو فوجی افسر قبائل کے لشکر کو ہدایات دے رہا تھا مجھے اس کے بارے میں بھی شک تھا کہ وہ بھی اندرون خانہ قادیانی ہے اور وہ مسلمانوں کی فتح نہیں چاہتا تھا۔۱۱

ایم۔ ایم عالم مرحوم (سکواڈرن لیڈر) جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ہیرو:

''قادیانیوں نے ہمیشہ غداری کی ہے۔ یہ لوگ ملک اور قوم دونوں کے دشمن ہیں۔ میرے متعلق ان لوگوں نے افواہ اڑائی ہے کہ نعوذ باللہ میں قادیانی ہوں۔ میں ان پر لعنت بھیجتا ہوں''۔۱۲

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری علیہ الرحمۃ:

''مرزائی مار آستین ہیں۔ جو دن رات وطن عزیز کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں، نظام اسلامی کے راستے میں انہوں نے جس طرح رکاوٹیں پیدا کیں، ان سے ہم سب باخبر ہیں۔ اس فتنہ کے تدارک کی ذمہ داری ہم پر دوسروں سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔ ہم نے اگر اس میں کوتاہی کی تو یاد رکھئے آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی''۔۱۳

قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری مرحوم:

''مرزائے قادیان اور ان کے ایجنٹوں کی تحریریں، تقریریں اور تبلیغی تذویت ہیں۔ ان تذویروں کا مقصد دنیائے اسلام پر ''یہود'' کی حکومت قائم کرنا ہے''۔۱۴

حمید نظامی مرحوم:

''غیر ممالک میں پاکستان کے ''سفارتخانے'' تبلیغ مرزائیت کے اڈے اور ان کے جماعتی دفاتر معلوم ہوتے ہیں''۔۱۵

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ایٹمی ہیرو:

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ عرصہ دراز سے قادیانی ملک کے اندر اور باہر یہودی لابی سے مل کر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف بین الاقوامی سطح پر بے بنیاد پروپیگنڈہ کر کے پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش میں سرگرم عمل ہیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے مغربی ممالک کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں اور بے جا پابندیاں پیدا کر کے ہماری فنی ترقی کو مفلوج بنانے میں مشغول ہیں''۔۱۶

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو:

''قادیانی اتنے خطرناک ہیں، اس کا احساس مجھے ان دنوں میں ہوا ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ قادیانی مذہب کے لوگ اس قدر خوفناک ارادے رکھتے ہیں''۔۱۷

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ہیرو (ر) ائیر مارشل محمد اصغر خان:

''ہر صحیح العقیدہ مسلمان کی طرح میرا ایمان بھی ہے کہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں''۔ ۱۸

سابق صدر آزاد کشمیر سردار محمد عبدالقیوم خان:

''ہم آزاد کشمیر میں کوشش کر رہے ہیں کہ اس سرزمین کو قادیانیت کے فتنہ سے محفوظ رکھیں۔ وہاں انہوں نے بہت سازشیں کی ہیں۔ قادیانی پاکستان کی اہم شخصیتوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں''۔ ۱۹

سابق ڈپٹی اٹارنی جنرل سید ریاض الحسن گیلانی:

''عقیدہ ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے کی سزا موت ہے اور اسلامی مملکت میں یہ سنگین ترین جرم ہے، اس لئے اس جرم کے مرتکب کو سزا دینے کے لئے صرف حکومت کی مشینری کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنا ضروری نہیں بلکہ کوئی مسلمان بھی اس سلسلے میں قانون کو ہاتھ میں لے سکتا ہے کیونکہ یہی شریعت کا حکم ہے''۔ ۲۰

سابق وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی:

''این پی پی ۱۹۷۳ء کے آئین کو قادیانیوں سے متعلق غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی ترمیم سمیت تسلیم کرتی ہے''۔ ۲۱

سابق وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں:

مسلم لیگ کے دستور کے مطابق قادیانی غیر مسلم ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن نہیں بن سکتے۔ البتہ پاکستان کی دیگر اقلیتوں کے ورکر اس جماعت کے رکن اسی صورت میں بن سکتے ہیں بشرطیکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد اور نظریاتی اساس سے متفق ہوں۔ ۲۲

مفتی محمد حسین نعیمی بانی جامعہ نعیمیہ لاہور:

''قادیانی اپنے عقائد و نظریات کے باعث مرتد ہیں۔ ایسا شخص جو اسلام کے بعد کافر و مرتد ہوتا ہے، واجب القتل ہے''۔ ۲۳

سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو:

''قادیانیوں کے بارے میں آئینی ترمیم ملک کی منتخب اسمبلی میں اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی، اس لئے وہ ترمیم درست ہے اور اسے ختم نہیں کیا جائے گا''۔ ۲۴

سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو مرحوم:

''ختم نبوت کے منکرین (مرزائیوں) کے خلاف پوری قوت سے کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ توہین نبوت برداشت نہیں کی جائے گی۔ ختم نبوت کے منکرین اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا خاتمہ کرنے کے لئے حکومت پاکستان نے کئی موثر کارروائیاں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلامی دنیا کو پاکستان سے تعاون کرنا چاہئے''۔ ۲۵

سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف:

''حضور اکرم ﷺ کی شان میں کسی گستاخی پر کوئی بڑی سے بڑی سزا بھی کم ہے''۔ ۲۶

ملک محمد قاسم صدر پاکستان مسلم لیگ (قاسم گروپ)

''پاکستان مسلم لیگ ختم نبوت پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کا ایمان ہے جو کوئی اس عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں''۔ ۲۷

اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نذیر احمد غازی:

''یہ انتہائی ظلم کی بات ہے کہ قرآن مجید میں حضرت نبی آخر الزمان ﷺ پر نازل ہونے والی اکثر آیات مبارکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے چوری کر کے اپنے نام کے ساتھ منسوب کر

لی ہیں۔ اگر قادیانیوں کو ان کے مذہب کی تبلیغ کی اجازت دے دی جائے تو اس سے نہ صرف معاشرے میں ہیجان پیدا ہوگا بلکہ اخلاقیات بھی تباہ ہو جائیں گی''۔ ۲۸

حضرت مولانا خادم حسین رضوی (امیر تحریک فدایان ختم نبوت صوبہ پنجاب)

دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس سے قادیانیوں کو تشبیہ دی جائے یہ خنزیر سے بھی بدتر ہیں۔ قادیانی اسلام کے غدار اور انگلستان کے وفادار ہیں۔ یہودی، عیسائی، ہندو اور سکھ کافر جبکہ مرزائی، قادیانی نہ صرف کافر بلکہ مرتد اور زندیق ہیں۔ قادیانیوں سے میل جول اور تعلق ناطہ سب سے بڑی بے غیرتی ہے۔ قادیانیوں سے رشتہ کرنا حرام اور ان کی اولاد حرامی ہے۔ ۲۹

☆☆ حواشی ☆☆

(۱)۔ فوائد فریدیہ ص ۱۳، مضمون خواجہ غلام فرید "ضیائے حرم" دسمبر ۱۹۷۴ء
(۲)۔ احکام شریعت ص ۱۲۲،۱۲۲، ۱۷۷۔ (۳) تذکرہ مجاہدین ختم نبوت۔
(۴)۔ ملفوظات طیبہ ص ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ (۵)۔ ماہنامہ ضیائے حرم دسمبر ۱۹۷۴ء
(۶)۔ علامہ اقبال کا مکتوب پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام ۲۱ جون ۱۹۳۶ء
(۷)۔ ہفت روزہ "لولاک" دسمبر ۱۹۷۱ء۔ (۸) ارشادات نورانی از ضیاء المصطفیٰ قصوری۔
(۹)۔ ہفت روزہ "ختم نبوت" مارچ ۱۹۷۴ء۔ (۱۰) ہفت روزہ "رضوان" ۱۹۵۲ء ج ۵ شمارہ ۲۹
(۱۱)۔ ماہنامہ "لا نبی بعدی" لاہور مجاہدین ختم نبوت نمبر نومبر ۲۰۰۳ء ص ۲۰۲ سید عقیل انجم (کراچی)
(۱۲) ہفت روزہ "لولاک" جلد ۲۳ شمارہ ۲۸، مارچ ۱۹۸۸ء (۱۳) ماہنامہ ضیائے حرم دسمبر ۱۹۷۴
(۱۴) قادیانی امت، از محمد شفیع جوش۔ (۱۵) ماہنامہ "صوت الاسلام" "تحبیز" اکتوبر ۱۹۸۵ء
(۱۶) ہفت روزہ "چٹان" جلد ۳۹ شمارہ ۳۴، ۳۱ اگست ۱۹۸۶ء۔
(۱۷) مقالہ مولانا تاج محمود علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۹۱ء۔ از محمد ندیم
(۱۸) ہفت روزہ "لیل و نہار" ص ۲ ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی ۲۲، ۲۹ جون ۱۹۷۴ء
(۱۹) ہفت روزہ "لولاک" مارچ ۱۹۷۴ء۔ (۲۰) روزنامہ "نوائے وقت" کراچی ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء
(۲۱) روزنامہ "مشرق" لاہور، ۱۰ ستمبر ۱۹۸۶ء۔ (۲۲) روزنامہ جنگ لاہور ۸ نومبر ۱۹۸۶ء
(۲۳) روزنامہ جنگ لاہور ۱۹۸۶ء۔ (۲۴) روزنامہ جنگ ۱۹۸۷ء
(۲۵) ریڈیو رپورٹ، ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء۔ (۲۶) روزنامہ نوائے وقت ۲۰ مئی ۱۹۹۱ء
(۲۷) ہفت روزہ "لیل و نہار" ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی، جولائی ۱۹۷۴ء۔
(۲۸) روزنامہ نوائے وقت ۲۳ مئی ۱۹۹۱ء۔ (۲۹) مرزائیت، قادیانیت اور احمدیت کیا ہے؟ ص ۱۵، مطبوعہ لاہور

ایک عظیم صحافی

مولانا **فقیر محمد** جہلمی رحمۃ اللہ علیہ

جس نے پادریوں کا منہ بند کر دیا

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے ''عیسائی مبلغین اور علمائے اسلام'' میں اُن علما کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے جنہوں نے برصغیر پاک و ہند میں انگریزی تسلط قائم ہونے کے بعد قلمی طور پر انگریز پادریوں کا مقابلہ کیا اور شاندار مناظرانہ لٹریچر تخلیق کر کے باطل کا قلع قمع کیا۔

ان قلمی مجاہدوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ایک نمایاں ترین نام ہے جنہوں نے پادری عماد الدین کو ایک طویل قلمی مناظرے میں شکست سے ہمکنار کر کے بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی۔ اس مناظرے کی شہرت سن کر لاہور کے ایک چوبیس سالہ نوجوان صحافی مولانا فقیر محمد جہلمی اتنے متاثر ہوئے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے شاگرد ہو گئے۔ اس نوجوان صحافی نے آگے چل کر مسلم اُمہ کی علمی راہنمائی کے ضمن میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور قوم کے فکری قائدین میں ایک بلند پایہ مقام حاصل کیا۔

آیئے اس نوجوان صحافی کی زندگی کے اوراق کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی سنوارنے کی کوشش کریں۔ آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں اپنی آپ بیتی لکھتے ہیں۔

''راقم یعنی فقیر محمد بن حافظ محمد سفارش، بقرینہ غالب ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں موضع چتن میں جو شہر جہلم سے دو میل کے فاصلہ پر بجانب غرب واقع ہے پنجشنبہ کے روز رات کے وقت پیدا ہوا۔ جب چھ سات سال کا ہوا تو پڑھنے پر بٹھایا گیا اور قرآن شریف کے ختم کے بعد کتب فارسیہ میں مشغول ہوا اور موضع ٹالیانوالہ میں جو چتن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، میاں قطب الدین مرحوم سے پڑھنے جاتا لیکن اکثر روز راستہ میں ہی موضع جادہ میں اپنے ماموں حافظ

فتح علی مرحوم کے پاس رہ جاتا اور اپنے ماموں زادہ میاں غلام محمد مرحوم سے بھی جو ایک ذہین و مستعد صاحب علم تھے، استفادہ کرتا، اسی اثناء میں فقیہ اجل، عالم بے بدل مولوی نور احمد صاحب تلمیذ فقیہ فاضل، محدث کامل مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی مصنف ازالۃ الاوہام و اعجاز عیسوی و اظہار الحق وغیرہ حال نزیل و مدرس مکہ معظمہ جب لاہور سے مراجعت فرما کر اپنے وطن مالوفہ موضع کھائی کوٹلی میں جو جہلم سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے، سکونت پذیر ہوئے تو یہ احقر بھی ان کے درس میں، جو اس وقت علاقہ جہلم میں کیا بلکہ کل پنجاب میں ایک بے نظیر گنا جاتا تھا۔ حاضر ہوا اور کئی سال ان کی خدمت میں صرف، نحو، فقہ و دیگر علوم کی ابتدائی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ بعد ازاں راولپنڈی چلا گیا جہاں پہلے مولوی عبدالکریم صاحب حال مفتی شاہ پور سے، جو کچھ دنوں کے لئے وہاں وارد تھے۔ منطق شروع کی اور ان کے وہاں سے چلے جانے پر مولوی محمد حسن صاحب فیروزوالہ سے جو وہاں بہ تلاش روزگار تشریف لائے ہوئے تھے، پڑھنا شروع کیا، انہیں دنوں ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں دہلی کا ارادہ کر لیا اور ایک فوج کے ساتھ، جو کانپور کو جاتی تھی، دہلی میں پہنچا۔ پہلے پہل پنجابی کٹڑہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں حاضر ہوا۔ مگر انہوں نے یہ عذر کر کے کہ ہم معقولات نہیں پڑھا سکتے، مولوی محمد شاہ صاحب مصنف مدار الحق کے سپرد کر دیا لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد بستی نظام الدین اولیاء میں جناب صدر الافاضل اعز الاماثل مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور دہلی، تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث کی خدمت میں چلا گیا جن کے درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قراءۃً و سماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا اور اواخر ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوفہ میں آیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد لاہور چلا گیا جہاں فاضل جلیل القدر، فقیہ فرید الدہر مولوی کرم الٰہی صاحب متوفی ۱۲۹۲ھ سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا اور ساتھ ہی اس دوران خوشخطی حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو گئی اور ''مَن جَدَّ وَجَدَ'' کا مصداق ہو کر مطبع آفتاب پنجاب لاہور میں کتابت کی خدمت پر مقرر ہو گیا۔

خورشید احمد خاں لکھتے ہیں:

مولوی صاحب نے ایرانی خوشنویس مرزا امام ویردی سے خوشنویسی کی مشق شروع کی،

پھر ان کے شاگرد صوفی غلام محی الدین وکیل سے اصلاح لی اور بعد میں میر احمد حسن کاتب دہلوی سے کتابت سیکھ کر چندے مطبع ناظر خیر اللہ خان کابلی میں کتابت کا کام کیا۔ ۱۸۶۷ء سے ''مطبع آفتاب پنجاب'' میں قانونی کتب کی کتابت شروع کی اور ساتھ ساتھ رسالہ ''انوار الشمس'' کی ادارت بھی کرتے رہے۔

صحافتی خدمات:

۱۳ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ سے جہلم میں اپنے لخت جگر محمد سراج الدین کے نام پر مطبع سراج المطابع قائم کیا اور اخبار سراج الاخبار جاری کیا، اس اخبار نے اپنے دور کے اعتقادی فتنوں خاص طور پر فتنہ مرزائیت کی تردید کے لئے بڑا کام کیا۔

تردید نصاریٰ کے بارے میں آپ کے مضامین ''کوہ نور'' لاہور اور اخبار ''منشور محمدی'' مدارس میں چھپتے رہے۔

سیرت و اخلاق:

بنی مریم نے بتایا کہ مولوی صاحب کا قد و قامت درمیانہ اور رنگ سفید تھا، داڑھی اور بالوں کو مہندی لگایا کرتے تھے، لباس کرتہ اور کھلے پانچوں کا پاجامہ، کرتے پر واسکٹ یا اچکن، کبھی کبھار اوپر جبہ بھی پہن لیتے، سر پر پگڑی اس طرح باندھتے کہ دونوں کان چھپ جاتے، شرم و حیا کا یہ حال تھا کہ نماز کے لئے مسجد جاتے تو چہرے پر رومال ڈال لیتے تاکہ گلی میں بیٹھی ہوئی محلہ کی عورتوں پر نظر نہ پڑے، پانچوں وقت کی نماز مسجد میں ادا کرتے۔

تصنیف و تالیف:

تذکرہ اکابرین سنت صفحہ ۳۹۲ پر علامہ عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں کہ مولانا کو تصنیف و تالیف سے خصوصی لگاؤ تھا۔ انہوں نے اہم کتابیں یادگار چھوڑیں جنہیں علمی طبقہ میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھا گیا، تصانیف کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اردو ترجمہ تصدیق المسیح۔

۲۔ حاشیہ صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان۔

۳۔حاشیہ ابحاث ضروری (ہر دو تصانیف مناظر اسلام حافظ ولی اللہ لاہوری)

۴۔تکملہ مباحثہ دینی (مناظرہ مابین مناظر اسلام مولانا حافظ ولی اللہ لاہوری و پادری عماد الدین)

۵۔زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل۔

۶۔رسالہ آفتاب محمدی۔

۷۔عمدۃ الابحاث فی وقوع الطلقات الثلاث (اس امر میں کہ تین طلاقیں بیک وقت واقع ہو جاتی ہیں، ایک غیر مقلد کے شکوک وشبہات کا جواب)

۸۔حدائق الحنفیہ (حنفی علماء کا تذکرہ) وغیرہ وغیرہ، اس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔

۹۔السیف الصارم علی المنکر شان الامام الاعظم۔

''صلوٰۃ والوتر کصلوٰۃ المغرب'' بجواب فتوی مولوی احمد اللہ و مولوی حسام الدین صاحبان ساکن کوٹلہ ائمہ تحصیل جہلم جو ایک رکعت وتر یا تین رکعت بیک تشہد کے قائل ہیں۔ ۱۳۱۵ھ میں تصنیف کی۔ اہل البدع والاعتساف اور ''السیف المسلول لاعداء خلفاء والرسول'' تردید شیعہ میں اور ''ہدیۃ النجباء فی ابطال نکاح غیر الکفو بغیر رضی الاولیاء'' بھی آپ کی تصانیف ہیں۔ انتقال کے وقت آپ کی ایک تصنیف زیر طبع تھی جو نامکمل رہ گئی۔

اولاد:

مولوی صاحب کا خاندان قطب شاہی اعوان تھا۔ آپ نے دو شادیاں کیں۔ ''مولوی فیروز الدین صاحب (بانی فیروز سنز) نے اپنی کتاب ''جہاد زندگی'' میں صفحہ ۱۸۴ پر لکھا ہے جب تک دونوں بیویاں بقید حیات تھیں تو مولوی صاحب کو جو آمدنی ہوتی تھی، کوڑی کوڑی تک نصف نصف تقسیم کر دیا کرتے تھے'' پہلی بیوی جہلم کی اپنے رشتہ داروں میں سے تھیں، ان سے ایک بیٹی غلام فاطمہ پیدا ہوئیں جن کی شادی اپنے تایازاد (مولوی صاحب کے بڑے بھائی مولوی غلام محمد کے بیٹے) غلام نبی، پی ڈبلیو آئی، ریلوے سے ہوئی۔ ان کے ایک بیٹے عبد الرحمٰن حشین محلہ جہلم میں قیام پذیر ہیں۔

دوسری بیوی جنت بی بی کا تعلق امرتسر سے تھا، ان سے ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں۔

دو لڑکیوں اور بیٹے (محمد سراج الدین) کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ ۱۸۹۸ء میں تیسری بیٹی غلام زینب پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی محمد عبد القادر پی۔ ڈبلیو۔ آئی ریلوے سے ہوئی۔ یہ اُردو ادبی حلقوں میں مسز عبد القادر کے نام سے خاصی معروف ہیں۔ ''لاشوں کا شہر''۔ ''راہبہ''۔ ''صدائے جرس'' وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں بعارضہ دمہ قلبی انتقال کیا، قبرستان شاہ بدر دیوان لاہور میں اپنے شوہر اور والدہ کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں، ان کے ایک صاحبزادے اردو کے معروف شاعر سراج الدین ظفر اپنی والدہ کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے، مولوی صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی غلام مریم صاحبہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی شادہ مولوی فیروز الدین (بانی فیروز سنز) کے سب سے بڑے بیٹے عبد المجید خاں (متوفی ۱۹۶۴ء) سے ہوئی۔

اکلوتے اور پیارے فرزند محمد سراج الدین کا چھ سال کی عمر میں بعارضہ تپ محرقہ و سرسام انتقال ہو گیا جس سے انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ اس صدمہ کو بھلانے کے لئے اگست ۱۸۸۷ء میں کشمیر کا سفر اختیار کیا، اسی زمانہ میں ''تقلید ائمہ اربعہ'' لکھی ۱۹۰۶ء میں آنکھوں کی تکلیف ہوئی، ڈاکٹر میر ہدایت اللہ اسسٹنٹ سرجن جہلم کے علاج (غالباً موتیابند کے اپریشن) سے شفا ہوئی۔ آخری عمر میں مولوی صاحب کو ایک صدمہ پہنچا یعنی ایک نامہ نگار کی غلطی پر ۷ فروری ۱۹۱۲ء کو حکومت پنجاب نے ان سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی، ضمانت داخل نہ ہو سکنے کے سبب مطبع اور اخبار بند ہو گئے اور مولوی صاحب بیمار ہو گئے۔ مقامی حکام کی سفارش پر زر ضمانت میں تخفیف ہوئی تو اخبار چار ماہ کی بندش کے بعد دوبارہ جاری ہوا۔ چندہ ماہ بعد مرض اسہال (محترمہ غلام مریم صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ وفات سے پہلے مولوی صاحب کو بار بار اجابت ہو رہی تھی مگر وہ ہر اجابت کے بعد وضو کرتے، آخرت وقت تک کوئی نماز قضا نہیں کی اور فرماتے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بے وضو جانا پسند نہیں کرتا) میں مبتلا ہو کر ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء بمطابق ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ بروز چہار شنبہ ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جہلم شہر کے قبرستان میں اپنے بیٹے سراج الدین کے پہلو میں دفن ہوئے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا **محمد صالح** نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

اقبال اور فیض کی سرزمین سیالکوٹ نے جہاں زندگی کے دیگر مختلف شعبوں کے نامور سپوت پیدا کئے وہیں اسلام کے گلشن کی آبیاری کرنے والی عظیم شخصیات کو بھی جنم دیا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی "مجدد الف ثانی" کا لقب دینے والے حضرت ملا عبدالحکیم سیالکوٹ سے لے کر امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ، مولانا شاہ ضیاء الدین مدنی اور پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی تک اور مولانا ابوالنور محمد بشیر سے لے کر پاسبان مسلک رضا مولانا ابوداؤد صادق تک حضور ﷺ کے ہزاروں غلام اس مردم خیز خطہ سے ابھرے اور چار دانگ عالم میں عظمت اسلام کے پھریرے لہراتے چلے گئے۔

اسی ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں حضرت مولانا مست علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں "محمد صالح" نامی ایک اسم بامسمی بچے نے آنکھ کھولی۔ آپ ابھی صرف تین برس کے تھے کہ اکثر بڑے لوگوں کی طرح یتیم ہو گئے۔ آپ کے تایا جان مولانا امیر علی نے آپ کو ناظرہ قرآن پاک پڑھایا اور آپ کی نیک سرشت ماں نے دینی اور روحانی خطوط پر آپ کی شاندار تربیت فرمائی جس کے اثرات آپ کی پوری زندگی پر محیط ہیں۔

آپ لڑکپن ہی میں گجرات کے قریب واقع ایک نقشبندی خانقاہ باولی شریف سے وابستہ ہوئے اور نوجوانی میں ہی شیخ طریقت حضرت غلام محی الدین نقشبندی مجددی سے سلسلہ نقشبندیہ میں خرقہ خلافت حاصل کر لیا۔ جو آپ کے صفائے باطن کی دلیل ہے۔ 1986ء میں آپ تلاش معاش میں لاہور چلے آئے اور محکمہ ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی اور لاہور کے مختلف مدارس میں جز وقتی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق آپ کو وہبی طور پر ودیعت ہوا تھا اور اشاعتی کام کی اہمیت کا پورا پورا ادراک رکھتے تھے جس کا اظہار آپ نے اپنی کتاب "تحفۃ الاحباب فی مسئلہ ایصال ثواب" کے چھٹے صفحے پر بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"برادران احناف آپ زمانہ کی رفتار اور دیگر مذاہب کی اشاعت کی طرف توجہ کریں کہ وہ کیسی سرگرمی اور جانفاہ کوششوں سے اپنے عقائد باطلہ کی اشاعت کر رہے ہیں کہ آئے دن ہم میں سے کتنے ہی اشخاص نکل کر ان کے ہم خیال ہو رہے ہیں"۔

آپکے اسی "اشاعتی شعور" کا مظہر "کتب خانہ حنفیہ" تھا جو آپنے لاہور میں قائم فرمایا اور اس کتب خانے کے ذریعے اسلام وسنیت کی خوب خوب اشاعت فرمائی۔ کتب خانہ حنفیہ ایک تجارتی ادارہ تھا لیکن اسکی پالیسی خدمت واشاعت اسلام تھی۔ جس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو مولانا موصوف نے 1906ء میں ایک عالم دین کے نام لکھا تھا۔ ذیل میں اس خط کا ایک اقتباس پڑھئے۔

"نیز اگر کوئی دینی کتب فارسی، اردو وغیرہ مطلوب ہوا کرے تو ہمارے کتب خانہ سے طلب فرمایا کریں انشاء اللہ دیگر کتب فروشوں سے بارعایت مال بھیجا جائے گا"۔

حضرت مولانا مرحوم کا اصل میدان تصنیف و تالیف ہی رہا اور آپ اسی میدان کے مرد رہے۔ قسام ازل نے آپ کے قلم کو تاخیر کی دولت بخش رکھی تھی۔ راقم نے آپ کی چند کتابیں ملاحظہ کی ہیں، الہامی طرز نگارش اور زود نویسی آپ کے قلم کے نمایاں اوصاف ہیں۔

"میں نے قریباً ایک سو کتب مختلف مذہبی مضامین پر تیار کی ہیں اور حنفی مذہب اور صوفی مشرب کو مدنظر رکھا گیا ہے"۔ (مکتوب بنام مولانا غلام محی الدین دیالوی محررہ ۱۰ جون ۱۹۰۶)

اس مکتوب کے بعد آپ پچاس سے زیادہ سال تک زندہ رہے۔ اس طویل عرصہ میں نہ معلوم اس تعداد میں کتنا اضافہ ہوا ہوگا۔ آپ کی جن تصانیف کے نام معلوم ہو سکے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

☆ تصور شیخ صفحات ۴۰۔ ☆ ضرورت شیخ صفحات ۶۰۔ ☆ تاثیر کلام صفحات ۳۲۔ ☆ دعا صفحات ۶۰۔ ☆ فضائل الجمعہ صفحات ۱۰۰۔ ☆ فضائل الصیام صفحات ۲۰۔ ☆ تحقیق لیلۃ القدر صفحات ۶۰۔ گلدستہ تصوف صفحات ۲۰۰۔ ☆ ترغیب الجماعت صفحات ۶۰۔ ☆ وعید بے نمازاں صفحات ۱۰۰۔ ☆ التوحید صفحات ۴۰۰۔ ☆ پردہ۔ ☆ فقہ نعمانی ترجمہ اردو خلاصہ کیدانی۔ ☆ فضائل رسول اللہ ﷺ یہ کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصے میں یارسول اللہ ﷺ کہنے کی تحقیق ہے۔ دوسرا حصہ زیارت قبور، زیارت روضہ مقدسہ کی شرعی حیثیت اور علامہ ابن تیمیہ کے نظریات کی تردید پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ حیات انبیاء و اولیاء کے بیان میں ہے۔ چوتھے حصے

میں استمداد و توسل کا بیان ہے۔ ☆ علم غیب۔ ☆ نماز حنفی مدلل، یہ کتاب کئی اجزاء پر مشتمل ہے۔ ☆ مسائل العیدین۔ ☆ قیام امام مہدی حصہ اول دوم۔ ☆ عامل بنانے والی کتاب۔ ☆ خطبات الحنفیہ۔ ☆ تحفۃ الاحباب فی مسئلہ ایصال ثواب زیر نظر کتاب جس کا مفصل تعارف آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔ ☆ جنگ بلقان۔ ☆ نماز مترجم۔ ☆ سلسلہ اسلام دس حصے۔ ☆ انوار اللمعۃ فی اسرار الجمعۃ۔ ☆ احتیاط الظہر۔ ☆ آداب سلام۔ ☆ شب برأت۔ ☆ مناجات۔ ☆ رسالہ حقہ۔ ☆ آسان سلسلہ تعلیم۔ ☆ سوانح عمری رسول مقبول ﷺ۔ اس کتاب کو روحانی پبلشر نے راقم کی نظرثانی کے بعد نئے عنوان ''سیرت رسول مقبول ﷺ'' کے ساتھ خوبصورت انداز میں عصری تقاضوں کے مطابق ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔

سیالکوٹ کے مشہور عالم شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ محمد عالم رحمۃ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں مولانا ابوالبشیر محمد صالح نقشبندی اکثر لاہور کے دہلی گیٹ کے اندر واقع مدرسہ حزب الاحناف میں آیا کرتے تھے۔ مستحق طلباء کو اپنے ساتھ لے جاتے، ان کی مالی امداد فرماتے اور انہیں پرتکلف کھانا کھلایا کرتے تھے۔ بعض بزرگ یوں بھی روایت کرتے ہیں کہ حضرت مولانا ابوالبشیر محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ گھر سے کھانا پکوا کر اپنے خدام سے اُٹھوا کر حزب الاحناف لایا کرتے تھے اور طلباء کو کھلایا کرتے تھے۔ یوں آپ نے حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ کی سنت مبارکہ کو زندہ کیا ہے۔

جس عہد میں آپ لاہور میں رہے اس عہد میں لاہور میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء حضرت مولانا سیّد دیدار علی شاہ متوفی ۱۹۳۵۔ ☆ پروفیسر حاکم علی متوفی ۱۹۴۴۔ ☆ پیر سیّد ابوالفیض قلندر علی سہروردی متوفی ۱۹۵۸۔ ☆ علامہ سیّد ابوالحسنات متوفی ۱۹۶۱۔ ☆ مفتی غلام جان ہزاروی متوفی ۱۹۵۹ کے علاوہ تفسیر نبوی پنجابی کے مؤلف مولانا نبی بخش حلوائی ۱۹۴۴۔ پروفیسر نور بخش توکلی متوفی ۱۹۴۸۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش متوفی ۱۹۵۹۔ مولانا غلام محمد ترنم ۱۹۵۹ لاہور کی علمی فضاؤں پر چھائے ہوئے تھے۔

اندازاً مولانا مرحوم نے بیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں وصال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک آپ کے آبائی گاؤں میتراں والی کی جامع مسجد کے صحن میں ہے۔

حضرت مولانا رُکن الدین الوری علیہ الرحمۃ

اس کی نگاہ سے بچنا۔
اس کی نگاہ میں نہ جانے کیا جادو ہے۔
جس پر نگاہ پڑ جاتی ہے وہ اپنا ''دھرم'' کھو بیٹھتا ہے۔
اور اس کی زبان پر ''کلمہ'' جاری ہو جاتا ہے۔

یہ وہ آوازیں تھیں جو ایک مسلمان بزرگ کے بازار میں تشریف لانے پر ریاست ''الور'' کے ہندوؤں کے مونہوں سے سنی جاتی تھیں۔

مسلمانوں کے اس صاحب نظر بزرگ کا نام مولانا رکن الدین الوری تھا۔ آیئے اس صاحب نظر بزرگ کے حالات زندگی کا مطالعہ کر کے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور بخشیں۔

حضرت مولانا رُکن الدین الوری رسول اللہ ﷺ کے مدنی میزبان حضرت ابوایوب انصاری کی آل پاک میں، بھارتی پنجاب کے ضلع گڑگانوں کے ایک غیر معروف قصبہ ''کھیڑلہ'' میں انیسویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے جب کہ ہندوستان میں انگریز تاجر سے تاجور کا روپ دھار چکے تھے۔

مولانا ابھی صرف چھ سال کے ہوئے تھے کہ اکثر بڑے لوگوں کی طرح یتیم ہو گئے۔ آپ کو آپ کے ماموں شیخ فریدالدین الوری نے اپنے پاس بلا لیا اور اپنے یتیم بھانجے کی ایسے شاندار خطوط پر تربیت کی کہ وہ شہرت و مقبولیت کی معراج کو پہنچ گئے۔

اس وقت الور میں مدرسہ قوت الاسلام (قائم شدہ 1890ء) کی بڑی شہرت تھی وہ نئی روشنی کے بھیانک اندھیروں میں پرانی تہذیب کا مینارۂ نور تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد (حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی) کے شاگرد دیدار علی شاہ محدث الوری

اس مدرسہ میں مہتمم تھے حضرت مولانا رکن الدین الوری نے ان کی شاگردی اختیار کی اور اپنا دامن علمی جواہر سے بھرا۔

1304 ہجری میں دلی کی جامع مسجد فتح پوری کے شاہی امام اور خانقاہ عالیہ مکان شریف کے خلیفہ مجاز علامہ مسعود احمد نقشبندی دہلوی کی بیعت کی اور ۵ سال ریاضت و مجاہدہ میں رہ کر سلوک نقشبندیہ کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔

بھارتی صوبہ راجستھان کے شہر جے پور کے بزرگ مولانا ہدایت علی جے پوری اپنی کتاب ''معیار السلوک'' کے صفحہ نمبر ۳۰۱ پر علامہ محمد مسعود نقشبندی دہلوی علیہ الرحمۃ کی تعریف میں لکھتے ہیں۔ حضرت مولوی مسعود صاحب کی کیا تعریف کی جائے کہ جن کے مرشد امام علی شاہ مکان شریفی جیسے ہوں اور ان کے خلیفہ اور طالب مولوی رکن الدین الوری صاحب جیسے ہوں۔

1309ء میں مولانا کے پیر و مرشد علامہ محمد مسعود نقشبندی دہلوی نے مولانا کو خرقہ خلافت عطا کیا اور اسی سال وہ وصال فرما گئے۔ ان کا مزار شریف دہلی میں ہے۔

بعد ازاں مولانا حج و زیارت کو پہنچے تو وہاں کعبۃ اللہ کے سائے میں آپ کی ملاقات افغانستان کے مشہور مجددی بزرگ حضرت خواجہ ضیائے معصوم کابلی سے ہوئی اور انہوں نے فرمایا مولانا ہمیں خانہ کعبہ سے اشارہ ہوا ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ آپ کو عطا کر دیں لہٰذا ہم آپ کو قادریہ نقشبندیہ چشتیہ سلسلوں کے علاوہ ''نسبت اویسیہ'' بھی عطا کرتے ہیں۔

حج و زیارت سے واپس تشریف لا کر مولانا نے دین و سنیت کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ایک طرف آپ جاہل مسلمانوں کی روحانی، اخلاقی اور علمی تربیت فرماتے اور دوسری طرف مشرکین ہند کو شرک کی آلودگیوں سے بچا کر اسلام کی فطری پاکیزگیوں کی طرف لاتے۔ آپ نے عمر بھر تبلیغی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے باوجود تصنیفی میدان میں بھی کام کرتے رہے۔ 1335 میں آپ نے مسلمانوں کو اپنے بنیادی عقائد سے آگاہ کرنے کے لئے ایک کتاب ترتیب دی جس کا نام ''توضیح العقائد'' ہے۔

پھر جب میلاد کا انکار کرنے والے نئے نئے مذہبی راہنما نمودار ہونے لگے تو پھر آپ نے 1339 میں ''مولود محمود'' لکھی۔ پھر 1345 میں ''روح الصلوٰۃ'' تصنیف فرمائی اور پھر رسالہ ''دافع طاعون'' اور رسالہ ''اربعین'' لکھے۔ یوں تو مولانا کی برکات نے اپنے عہد میں اہل اسلام کی فکری و نظریاتی ضرورتوں کو پورا کیا مگر ان کی کتاب ''رکن دین'' کو جو دائمی شہرت حاصل ہوئی وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔

مولانا کی تبلیغی مساعی کے مبارک اثرات پوری ریاست میں پھیل چکے تھے۔ آپ کے مریدین کا حلقہ ہندوستان بھر میں موجود تھا۔ آپ کے تلامذہ آپ کے مشن کو آگے بڑھا رہے تھے۔ آپ کی کتابیں اہل علم میں اپنا مقام پیدا کر چکی تھیں۔ ایک دن اچانک آپ نے جمعہ کے اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ جمعہ میری زندگی کا آخری جمعہ ہے، تمام دوست آخری مصافحہ کر لیں لوگ فرط جذبات میں آپ سے لپٹ گئے اور اپنے اپنے انداز میں اظہار عقیدت کرنے لگے اور بلائیں لینے لگے۔ آپ نے لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور شوال کی ۱۸ تاریخ کو اپنے فرزند ارجمند حضرت مفتی محمد محمود الوری کو خاندانی، علمی اور روحانی وراثتوں کا امین بنا کر ۲۱ شوال 1355 ہجری کو بہشت سدھار گئے۔ مفتی محمد محمود الوری علیہ الرحمہ حیدرآباد سندھ میں مدفون ہیں۔

مولانا رکن الدین الوری کے پوتے جامعہ رکن الاسلام حیدر آباد کے پرنسپل اور قومی اسمبلی کے رکن ابوالخیر ڈاکٹر محمد زبیر الوری کی نگرانی میں ہر سال ۲۱ شوال کو حیدر آباد میں مولانا کا عرس بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔

رکن دین پچھلے پورے سو سال سے برابر چھپ رہی ہے اور تاجران کتب کی اصطلاح میں اسے ''رننگ آئٹم'' کی حیثیت حاصل ہے۔ میری معلومات کے مطابق اردو دنیا میں بہار شریعت کے بعد یہ مقبول ترین فقہی کتاب ہے۔ ہر اشاعتی کمپنی اسے خوشی سے چھاپتی ہے اور چھاپنے کے بعد بھی خوش رہتی ہے۔

رکن دین کی اردو پچھلی صدی کی اردو ہے اور اب اردو کا محاورہ کافی ارتقائی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لہٰذا کسی اردو دان کا حق ہے کہ کتاب کی علمی و فقہی روح کو گزند پہنچائے بغیر اس کا محاورہ اردو کے جدید اسلوب کے مطابق ڈھالے تاکہ پچھلی صدی کی ''رکن دین'' کی مقبولیت آئندہ صدی میں بھی برقرار رکھی جا سکے۔

خلیفہ اعلیٰ حضرت مولانا محمود جان پشاوری جامجودھپوری

فرنگی استعمار کی شہ پر جب شاہ اسماعیل (شہید) اور سید احمد (شہید) نے صوبہ سرحد کے غیور اور ناقابل تسخیر سنی مسلمانوں کو اسلاف سے برگشتہ کرنے کی مکروہ تحریک کا آغاز کیا تو سوات کے ایک بزرگ حضرت اخوند صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے مرید سعید حضرت مولانا حافظ غلام رسول میر ملکزئی (رحمۃ اللہ علیہ) کو مسلمانوں کے اعتقادات کے تحفظ اور فرقہ واریت کی حوصلہ شکنی کے لئے تیار کیا۔ حضرت مولانا حافظ غلام رسول میر ملکزئی (رحمۃ اللہ علیہ) سرداروں کے خانوادے کے چشم و چراغ ہونے کے ناطے بڑا معاشرتی اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ اور منقول و معقول کے جید عالم ہونے کے باعث زبردست دینی اہمیت کے حامل بھی تھے۔ آپ کے ذاتی کتب خانے میں ایسی ایسی نایاب قلمی کتابیں تھیں جو بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی موجود نہ تھیں۔ آپ کے حلقۂ ارادت اور درس میں کابل بلخ، قندھار، ثمرقند اور یارقند تک سے طالب حاضر ہوکر دینی علوم حاصل کرتے تھے۔ آپ پشاور اور گردونواح کے لوگوں کے شرعی فیصلے بھی کیا کرتے تھے۔ اور علماء کرام آپ کے فتووں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب آپ کے وعظ کا پروگرام ہوتا تو باقاعدہ "ڈھنڈورا" پیٹا جاتا تھا۔ اور آپ کے وعظ کے پروگرام تین تین چار چار ماہ تک مسلسل ہوا کرتے تھے۔ جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے اور فیوض و برکات حاصل کرتے۔ رمضان شریف میں آپ کو خصوصی طور پر حضرت اخوند صاحب کے آستانے پر تراویح میں قرآن پاک سنانے کیلئے مدعو کیا جاتا۔ اور اخوند صاحب سمیت تمام لوگ نہایت ذوق سے آپ کا قرآن سنتے۔ جب شاہ اسماعیل اور سید احمد (شہید) کی نئی نویلی تعلیمات سامنے آئیں تو آپ نے میدانِ مناظرہ میں ان کو چیلنج کیا۔ اور تقلید کے باغیوں کو کئی مرتبہ میدانِ مناظرہ میں شکستِ فاش دی۔

صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ سے نکلنے والے ماہنامہ تحفہ حنفیہ کے ایڈیٹر مولانا ضیاء الدین پیلی بھیتی لکھتے ہیں۔ "اگرچہ ایک مدت تک اس مردحق (حضرت مولانا غلام رسول میر ملکزئی) کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انجام کار مولا تبارک وتعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔ وہابیہ سے بعض قتل ہوئے اور بعض پر زدوکوب اور اکثر وہابی اپنی جان بچا کر بھاگ گئے"۔ (مقدمہ ذکر رضا مطبوعہ لاہور ص 18)

1835ء میں حضرت حافظ غلام رسول میر ملکزئی کے ہاں ہمارے ممدوح محترم مولانا محمود جان پشاوری نے جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی، بعد ازاں دہلی کے دارالعلوم امینیہ سے درس نظامی مکمل کیا۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک قصبہ جامجودھپور کی خوش نصیبی مولانا محمود جان پشاوری کو وہاں لے گئی۔ اور رفتہ رفتہ آپ پشاوری سے جامجودھپوری ہوگئے۔

سلوک کی منازل طے کرنے کیلئے پیر کامل کی جستجو میں نکلے اور بریلی کے تاجدار کی صحبت میں روحانی مقامات طے کئے۔ امام احمد رضا (رحمۃ اللہ علیہ) آپ کی بزرگی، دین داری اور خاندانی پس منظر سے اتنے متاثر ہوئے۔ کہ آپ کو طریقت کے چاروں سلسلوں میں اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ اور اظہار محبت کے لئے اپنا استعمال شدہ کرتا پاجامہ انگرکھا اور عمامہ شریف مولانا کو عطا فرمائے۔ آپ بھی اس محبت کے جواب میں ہمیشہ اعلیٰ حضرت (علیہ الرحمۃ) کے افکار کے ترجمان رہے اور ہمیشہ اُن کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کے وصال کے فوراً بعد 1921ء میں آپ نے ایک طویل نظم 266۔ اشعار میں منظوم سیرت اعلیٰ حضرت لکھی۔ جس کا عنوان ذکر رضا اور اعداد 1921 ہیں۔ یہ کتاب سیرت اعلیٰ حضرت پر نقش اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنے شیخ کی منقبت میں بھی آپ نے 35۔ اشعار کہے۔ ایک اور نظم میں اپنے پیرو مرشد کے فرزندوں مولانا حامد رضا بریلوی، اور مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کے لئے دعائیہ جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے مزار شریف کے گنبد کا ڈیزائن بھی آپ ہی کا تجویز کردہ ہے۔ اعلیٰ حضرت اپنے اس عظیم خلیفہ سے کس قدر محبت رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اعلیٰ حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ جس کے چیدہ چیدہ حصے قارئین کے ذوق

مطالعہ کے نذر ہیں۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ بملاحظہ مولانا المکرم ذی المجد والکرم حامی سنن ماحی الفتن مولانا مولوی محمود جان صاحب دام فضائلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بھائی مولوی غلام مصطفیٰ صاحب بخیریت ہیں؟ اپنے یہاں کی خیریت سے مطلع فرمایئے۔ آپ کی زیارت برسوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور میں کثیر الاشغال کثیر النسیان جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدہ الاستمداد کے آخر میں جو اپنے احباب حامیانِ سنت کے اسماء گنائے ان میں آپ کا نام نامی کو سونے کے حرفوں سے لکھنے کا تھا۔ سہو ہوگیا۔ طبع کے بعد یاد آیا۔ جس کا اب تک افسوس ہے۔ خیریت سے اطلاع بخشئے۔ سب احباب کو سلام والسلام مع الاکرام۔ فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ چار ربیع الآخر ۱۳۳۹ھ"۔

آپ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ مہلک زخم پر لعاب دہن لگا دیتے تو مریض شفا پا جاتا۔ جادو ٹونہ اور جن بھوتوں کے ستائے ہوئے لوگ آپ سے روحانی علاج کراتے۔ بیماریوں کے روگی آپ سے طبی فوائد حاصل کرتے، مہمان بن کر آنے والے آپ کی روایتی اور خاندانی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے اور مسائل معلوم کرنے والے آپ سے دینی راہنمائی حاصل کرتے۔ الغرض جامجودھپور کے بچے بوڑھے جوان اور عورتیں آپ کا دل سے احترام کرتے۔ اور لفظ "باپو" کو اس کے اظہار کا ذریعہ بناتے۔ حضرت مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی (حفظہ اللہ تعالیٰ) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ مولانا نے جامجودھپور کی جامع مسجد میں تقریباً 80 برس امامت و خطابت اور تبلیغ و تدریس فرمائی اور دینی خدمات بلا معاوضہ انجام دیں۔ اور ذریعہ معاش تجارت رکھا۔ مہمان نوازی اور اہل علم کی خاطر داری میں مشہور تھے۔ بدمذہبوں سے مناظرے بھی کئے وہ راہِ حق میں تمام عمر مردِ میدان رہے۔ (جہان رضا لاہور فروری 2005)

3 صفر 1370ھ/نومبر 1950ء میں 115 سال کی عمر پا کر جامجودھپور میں وصال فرمایا۔ جہاں آپ کا روضہ مبارک مرجع خلائق ہے۔ آپکے فرزند اکبر حضرت مولانا غلام مصطفیٰ

ل تک ڈربن کی گرے اسٹریٹ کی جامع مسجد میں خطیب رہے۔ دوسرے فرزند کا نام آپ
ٰی حضرت علیہ الرحمۃ کے نام پر احمد رضا رکھا۔ اور ادب سے ان کو حضرت صاحب کہتے تھے۔
ں ایک دختر نے 1425ھ کے رمضان شریف میں جمعۃ الوداع کو عصر کی نماز پڑھ کر مصلّٰی پر
پنے شوہر حضرت مولانا قاری احمد رضا کو گواہ بنا کر کلمہ طیبہ پڑھا اور کہا میں جا رہی ہوں۔ اس
ں 70 برس کی عمر میں مبارک ساعتوں میں رحلت فرمائی۔ ابھی دو بیٹیاں زندہ سلامت ہیں۔
کی اولاد میں بڑی برکت ہوئی۔ آج بھی آپ کی اولاد پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ
فریقہ کے مختلف شہروں میں آباد ہے۔ آپ کے نواسے منصور رضا۔ امتیاز رضا۔ اور عسکری رضا
ءوے کے شہر ہرارے میں رہتے ہیں۔ اور وہاں پر ہر سال عرس رضوی محمودی ایسے شایانِ
ں طریقے سے مناتے ہیں کہ دنیا کے چھ سات ممالک کے اہل ذوق اس عرس میں شریک
تے ہیں۔

حضرت علامہ سید خلیل احمد کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳ویں صدی ہجری کے عظیم بزرگ اور سادات امروہہ کے دُرِّ ثمین حضرت سید مختار احمد کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ۱۶-نومبر ۱۸۹۶ء کو آنکھ کھولی۔ والد ماجد حضرت مختار احمد کاظمی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سلوک کی منازل طے کیں۔ سلسلہ عالیہ صابریہ چشتیہ میں خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ابتدائی فارسی اور عربی گھر میں مکمل کی اور شرح جامی تک پڑھنے کے بعد رامپور کے مشہور مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا اور تکمیل علوم فرمائی۔

ماہ رجب میں جب امتحانات سے فارغ ہوئے تو شوق پیدا ہوا کہ رمضان میں تراویح پڑھاؤں۔ لہٰذا رجب میں حفظ شروع کیا اور شعبان تک کئی پارے حفظ کر لئے۔ رمضان شروع ہوا تو کیفیت یہ تھی آپ شروع کے پارے تراویح میں سنا رہے تھے اور آخری پارے حفظ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ آخری آخری پارے رمضان ہی میں حفظ کر لئے اور رمضان ہی میں تراویح میں سنا دیئے۔

ادب، لغت، ہیئت، ریاضی، صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع کے ماہر تھے۔ تدریس کا انداز ایسا اچھوتا تھا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی فن کی کیسی ہی کتاب پڑھانی ہو مطالعہ کے بغیر بھی اس بے تکلفی سے پڑھاتے کہ معلوم ہوتا زبانی یاد کی ہوئی ہے۔

آپ نے بھارت کے شہروں "بلند شہر"، "امروہہ" اور "شاہ جہاں پور" کے دینی مدارس میں ایک عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں اور ہزاروں قابل علماء پیدا کئے۔ حضرت مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف بہار شریعت) اور حضرت امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ آپ نے ۲۸-نومبر ۱۹۷۰ء کو وصال فرمایا۔ امروہہ میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اعلیٰ شعری ذوق پایا تھا۔ صاحب دیوان شاعر تھے اور خاکی تخلص کرتے تھے۔ نمونے کے طور پر آپ کے چند نعتیہ کلام پیش خدمت ہیں۔

رب نے تجھے بخشی ہے وہ عزت شب معراج
ہے تاج زماں اک تری ساعت شب معراج

بد کی معبود سے خلوت شب معراج
اللہ کی رحمت پہ ہے رحمت شب معراج

ل امیں لائے ہیں دعوت شب معراج
مشتاق ہے دیدار کی جنت شب معراج

عبہ اطہر سے سر عرش علیٰ تک
رخسار محمد کی صباحت شب معراج

راب میں مستغرق دیدار احد ہیں
جبریل کو ہے شوق معیت شب معراج

رش پہ اڑتا ہے رفعتا کا پھریرا
کیا شرح کی صورت میں ہے رفعت شب معراج

ق ہے اقصیٰ میں رسولوں کی جماعت
محبوب خدا کی ہے امامت شب معراج

کوتی پہ رہے سارے فرشتے
رکنے نہیں دیتی انہیں وحدت شب معراج

عرش بریں کی یہ تمنا کہ خدا دے
پابوسی محبوب سے رفعت شب معراج

جو ادب نے تو کہا جلوہ رب نے
آ پردہ میں دیکھ اپنی حقیقت شب معراج

رت موسیٰ نے طلب پر بھی نہ پایا
ہم تجھ کو وہ خود دیتے ہیں رویت شب معراج

ت کو بھی معراج کے زینے پہ چڑھا دے
بخش ان کو نمازوں میں وہ قربت شب معراج

ب نے جاگیر میں بخشی وہ امانت
امت کو کیا عامر جنت شب معراج

دنیا میں تو خاکی شب غفلت سے ہے محجوب
کھل جائے گی کل روز قیامت شب معراج



موت جب دامنِ رحمت کی ہوا لائی ہو
مرنے والے کو نہ کیوں چین کی نیند آئی ہو

اس کے ہونٹوں کے تبسم پہ نہ کیوں جاں ہو نثار
جن کی ٹھوکر میں بھی اعجاز مسیحائی ہو

روضہ خلد بریں کیوں نہ ہو تربت اس کی
خاک طیبہ پہ کبھی جس کی جبیں سائی ہو

کنج مرقد میں دکھا دو رُخِ انور مولا
غیرت خلد مرا گوشہ تنہائی ہو

تیرے دربار سے ملتا ہے انہیں بھی صدقہ
دو جہاں میں بھی کبھی جس کی نہ شنوائی ہو

حمد رب کرتا ہوا جائے گا فردوس بریں
جس نے احمد کی غلامی کی سند پائی ہو

کیوں نہ خاکی تجھے اس در سے ملے گی صحت
خضر و عیسیٰ کی بھی جس در سے مسیحائی ہو



دکھا یارب فضائے گلشنِ اسرار کیسی ہے
بہارِ بوستانِ احمد مختار کیسی ہے

سنگھا خوشبوئے زلفِ احمدِ مختار کیسی ہے
نسیم عطر بیز کوچۂ دلدار کیسی ہے

چکھا دے چاشنیِ شربتِ دیدار کیسی ہے
تجلی جمالِ احمدِ مختار کیسی ہے

خلیل اللہ جملہ انبیاء ہیں اُن کے سایہ میں
تعالیٰ اللہ شانِ سید ابرار کیسی ہے

کلیم اللہ کو ہے فخر جس کی ہم کلامی سے
سنا دے اس لبِ جاں بخش کی گفتار کیسی ہے

نظر جب عالمِ رویا میں بھی صورت نہیں آتی
تو پھر دل میں الٰہی حسرتِ دیدار کیسی ہے

یہ سچ ہے میرے عصیاں کا اندھیرا قبر میں ہو گا
مگر شمعِ جمالِ رحمتِ غفار کیسی ہے

قیامت ہے اگرچہ عاشقوں کا ہجر میں مرنا
حیاتِ اشتیاقِ لذتِ دیدار کیسی ہے

بڑھایا خود کو خاکی سے تو مرتد ہو گیا شیطاں
نہ سمجھا یہ کہ خاکِ کوچۂ دلدار کیسی ہے



خلیفہءاعلیٰ حضرت

حضرت علامہ سیّد احمد ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ

ایران کے شہر ''مشہد'' سے رضوی سادات کے ایک بزرگ ''حضرت سیّد اسماعیل رضوی مشہدی'' کو اہل ہند کی خوش نصیبی ہندوستان لے آئی۔

اولاً آپ بلگرام آئے پھر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ یہ خاندان پہلے فرخ آباد اور پھر ریاست الور میں قیام پذیر ہوا۔ سیّد اسماعیل رضوی مشہدی کے پڑپوتے حضرت مولانا ابو محمد سیّد دیدار علی شاہ محدث الوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ۱۳۱۴ھ یعنی ۱۸۹۶ء میں ایک سعادت آثار بچے نے آنکھ کھولی جس کا نام ''احمد'' رکھا گیا۔ یہ بچہ آگے چل کر ''ابوالبرکات'' کی کنیت اور امام اہل سنت، مفتی اعظم اور استاذ العلماء ایسے ایسے عظیم القابات سے اسلامی دنیا میں معروف ہوا۔

سیّد دیدار علی شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے بلند پایہ محدث تھے (حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہما) کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے آپ نے ریاست الور میں ۱۸۹۰ء سے ایک ''دارالعلوم قوت الاسلام'' قائم کر رکھا تھا۔ جو اسلاف کی علمی اور تہذیبی روایات کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اسی جامعہ قوت الاسلام میں ''سیّد احمد'' نے صرف، نحو، منطق اور فلسفہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی بعد ازاں آپ کی قابلیت اور استعداد کے پیش نظر ''مدرسہ اہل سنت'' (موجودہ جامعہ نعیمیہ، مرادآباد) میں داخل کرایا گیا جہاں تحریک پاکستان کے نامور لیڈر خلیفہ اعلیٰ حضرت، صدرالافاضل حضرت مولانا سیّد نعیم الدین مرادآبادی نے آپ کی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کیا۔ یہاں سے آپ نے اوائل ۱۹۱۵ء میں درس نظامی مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ علم توقیت، علم

فلکیات اور اسلامی فلسفہ میں خصوصی مہارت حاصل کی اور ساتھ ہی طب کی ابتدائی کتابیں بھی شروع کیں۔ پھر استاد محترم کے حکم سے مرادآباد کے ایک معروف طبیب سے طب کی تکمیل کی اور ان کے مطب میں باقاعدہ پریکٹس بھی کرتے رہے، طبی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۵ء کے آخر میں حضرت صدرالافاضل نے اپنے اس ہونہار اور قابل شاگرد کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے آپ پر خصوصی نوازشات فرمائیں اور نوعمری کے باوجود آپ کو اپنے مدرسہ ''منظر الاسلام بریلی'' میں فتاویٰ نویسی کے اس بورڈ میں شامل فرمالیا جو جید علماء اور مفتیان کرام پر مشتمل تھا اور خود فاضل بریلوی اس کے نگران تھے۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ ''فتاویٰ رضویہ'' پہلے پہل آپ کی نگرانی اور حضرت مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں شائع ہوا اور ''بہار شریعت'' کے ابتدائی حصے بھی آپ ہی کی نگرانی میں چھپتے رہے۔

آپ کی محنت خلوص اور احساس ذمہ داری سے متاثر ہو کر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے آپ کو اپنی روحانی توجہات سے نوازا، طریقت کے تمام سلاسل کے اعمال و وظائف کی اجازت مرحمت فرمائی اور سلسلہ قادریہ میں اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اعلیٰ حضرت نے جو سند آپ کو عطا فرمائی اس پر مندرجہ ذیل تاریخ ثبت ہے ''ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ بمطابق ۱۹۱۶ء''۔

ان دنوں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا سیّد دیدار علی شاہ محدث الوری آگرہ کی جامع مسجد میں خطیب اور شہر کے مفتی اعظم تھے۔ آپ دو قومی نظریہ کے زبردست پرچارک تھے۔ لیکن آگرہ کے سادہ لوح مسلمان کانگریس کے ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی اور فاخر الہ آبادی جیسے ''وطن پرستوں'' کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے تھے اور انگریز دشمنی کی آڑ میں ہندو نوازی کا گھناؤنا کردار ادا کر کے ''قومیت اسلام'' کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ عوامی رجحان کے خلاف اور سیاسی مصلحتوں کے برعکس جب حضرت سیّد دیدار علی شاہ اسلام کے نظریہ وطنیت اور قومیت کو اُجاگر کرتے تو یہ سیاسی بازیگر اوچھے ہتھکنڈوں سے عوام کا ذہن خراب کرتے کبھی آپ کو پرانے دقیانوسی خیالات کا حامل قرار دیتے اور کبھی انگریز کا ایجنٹ کہتے۔ یہ دور ''مسلم قومیت'' کے لئے

نظریاتی سطح پر کام کرنے والے مسلم مبلغوں کے لئے کڑے امتحان کا وقت تھا۔ ایسے میں حضرت سیّد ابوالبرکات اعلیٰ حضرت کا فیضان نظر اور حضرت صدر الافاضل کی بے مثال تربیت لے کر اپنے والد محترم کی معاونت کے لئے آگرہ پہنچے اور ان کی تبلیغی جدوجہد میں ان کے شانہ بشانہ کام کیا اور کانگریسی مولویوں کا زور توڑا۔ اس دور کے ایک جلسے کے دلچسپ حالات خود سیّد ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنیے۔

''علماء اہل سنت کے جلسوں کو درہم برہم کرنے کے لئے سازشیں کی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ میں جامع مسجد آگرہ کے ایک گوشہ میں ''دوقومی نظریہ'' کی حمایت میں تقریر کر رہا تھا۔ مسجد کے دوسرے حصہ میں کانگریسی مولویوں کا جلسہ تھا انہوں نے ہمارے جلسے کے قریب بنے ہوئے شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تاکہ ہمارے جلسے میں افراتفری پھیلے۔ شہد کی مکھیاں بھنبھنا کر ہمارے جلسہ پر حملہ آور ہونا ہی چاہتی تھیں کہ میں نے اعلان کیا کہ سب مسلمان حسبی اللہ ونعم الوکیل کا ورد شروع کر دیں۔ چنانچہ جب اس وظیفہ کا ورد کیا گیا تو اللہ کی شان کہ شہد کی مکھیاں کانگریس کے جلسے کی طرف لوٹ گئیں اور ان کا جلسہ درہم برہم ہو گیا''۔

سیّد ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ نے اولاً اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مل کر اور ان کے لاہور چلے آنے کے بعد تن تنہا مذہبی اور سیاسی دونوں محاذوں پر ڈٹ کر کام کیا اور اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کیا اس عرصے میں ہندوستان میں مختلف تحریکیں اٹھیں اور آپ نے ہر باطل تحریک کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا اور تاریخ نے ہمیشہ آپ کے موقف کو صحیح ثابت کیا۔

غالباً قیام آگرہ کے دوران ہی آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے آپ کی شادی آپ کے ماموں حضرت مولانا سیّد مبارک علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہوئی۔ جو جلیل القدر اور صاحب کرامت بزرگ تھے اور الور میں آپ کا آستانہ روحانی علاج کے لئے بڑی شہرت رکھتا تھا قیام پاکستان کے بعد آپ سندھ کے شہر حیدرآباد میں تشریف لے آئے جہاں آپ کا مزار شریف اب بھی روحانی فیوض و برکات کا مرکز ہے۔ (سیّد مبارک علی شاہ کے فرزند اکبر حضرت مولانا سیّد

محمد علی رضوی بھٹو دور میں جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو کافر قرار دلوانے میں مولانا شاہ احمد نورانی شیخ الحدیث علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری اور مولانا محمد ذاکر کے ساتھ پارلیمانی جدوجہد میں شریک رہے)۔

قیام آگرہ ہی کے زمانے (۲۳ یا ۲۴) میں اللہ تعالیٰ نے سیّد ابوالبرکات علیہ الرحمہ کو نہایت لائق فائق فرزند سے نوازا جن کا نام نامی حضرت علامہ سیّد محمود احمد رضوی تھا اور جو علمی دنیا میں شارح بخاری کے لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔

حضرت سیّد دیدار علی شاہ لاہور میں مولانا محرم علی چشتی ایڈووکیٹ، سیّد محمد امین اندرابی اور حاجی شمس الدین کے مشورے سے ۱۹۲۴ء میں انجمن حزب الاحناف قائم کر چکے تھے۔ اسی سال سیّد صاحب کو لاہور بلا لیا گیا سیّد صاحب نے کچھ عرصہ مختلف جگہوں پر درویشانہ شان کے ساتھ علوم اسلامیہ کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تا آنکہ ۱۹۲۶ء میں دہلی دروازے کے اندر واقع شہنشاہ ہند شیر شاہ سوری رحمۃ اللہ علیہ کے عہد کی ایک ویران مسجد کو سال بھر کی محنت سے دوبارہ تعمیرا کروا کر باقاعدہ ''دارالعلوم حزب الاحناف'' قائم کیا۔ اس موقع پر امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی گرہ سے مبلغ 500 روپے چندہ عنایت فرمایا۔ (پیر صاحب علی پوری کی دریادلی کی دھوم سارے زمانے میں تھی عرب والے آپ کی سخاوت کے باعث ہی آپ کو ابوالعرب کے لقب سے یاد کرتے تھے آپ تحریک پاکستان کے ہی قائد نہیں بلکہ قائدین کے بھی قائد تھے آپ کی شان میں راقم نے کہہ رکھا ہے

آپ اس دیس کے ہر شخص کے محسن بیشک
یہ وطن آپ کا فیضان امیر ملت

ایک مرکز میسر آ جانے پر سیّد صاحب نے کھل کر اپنی بے پناہ تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ آپ کے انداز تدریس، انتظامی قابلیت، بے لوث خدمت اور سچی لگن نے حزب الاحناف کو چار چاند لگا دیئے اور آپ نہ صرف لاہور بلکہ سارے پنجاب کی مذہبی فضا پر

پوری طرح چھا گئے۔

اسی سال 1926ء میں آپ نے پاکستان ریلوے کے عظیم صنعتی مرکز "لوکو ورکشاپ" مغلپورہ لاہور میں جمعہ کی خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ جو آپ کے سال وصال ۱۹۷۸ء تک یعنی مسلسل ۵۲ سال تک جاری رہا۔ آپ کے خطاب کی اثر آفرینی کا یہ کمال ہے کہ بہت سے خوش نصیب اور باذوق لوگ صرف آپ کا خطاب سن سن کر ہی عالم کے درجے کو پہنچ گئے اور آج وہ خود جمعہ پڑھا رہے ہیں۔

اسی سال 1926ء میں آپ نے حجاز مقدس میں وہابی حکومت کی طرف سے صحابہ کرام کے مزارات مقدسہ کی پامالی اور اشراف اہل سنت پر ظلم و بربریت کے خلاف ۱۲ مارچ کو لاہور میں پہلا احتجاجی جلسہ عام منعقد کیا۔ جس کے اثرات پنجاب بھر میں پھیلے اور مسلمانان پنجاب نے نجدی لٹیروں کے خلاف کھل کر اپنے مذہبی جذبات کا اظہار کیا گویا آپ کے ایک جلسے سے اہل پنجاب کو زبان مل گئی۔ اس دور میں ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" نے آپ کے خلاف بڑی گھٹیا اور سوقیانہ زبان استعمال کی اور مشرکین مکہ کی "ہجوگوئی" کی مردہ روایت کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ لیکن آپ نے طعن و تشنیع کے تیر برداشت کیے مگر مقامات مقدسہ کی توہین و تضحیک برداشت نہ کی اور ظفر علی خان کی ہرزہ سرائیوں اور زہرافشانیوں کے جواب میں ہمیشہ قرآن و سنت کے دلائل سے مزین مثبت انداز فکر اپنایا۔ آپ کی تصانیف ضیاء القنادیل، وہابیوں کی کہانی، مزارات کی شرعی حیثیت اسی دور کی علمی یادگاریں ہیں۔

۱۹۳۶ء میں آپ نے اپنے پیر و مرشد سرکار کلاں حضرت سید علی حسین شاہ اشرفی جیلانی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ اور استاد محترم مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں حجاز مقدس کا سفر فرمایا اور حج و زیارت سے سرفراز ہوئے اہل محبت کی ضیافت طبع کے لئے آپ کی ذاتی ڈائری سے اس "سفر محبت" کے ابتدائی احوال نقل کیے جاتے ہیں۔

"۲۴ جنوری ۱۹۳۶ء بروز جمعۃ المبارک پانچ بجے شام دفتر حزب الاحناف لاہور

اندرون دہلی گیٹ سے روانہ ہوئے۔ احباب نے بکثرت پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے۔ راستے میں اور اصحاب ملے۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضاء آسمان گونج اٹھی۔ اسٹیشن پر اول مرادآباد کا ٹکٹ چھ روپے گیارہ آنے میں لیا اور اسباب کا کرایہ تین روپے بارہ آنے ادا کیے۔ اسٹیشن پر فقیر کو رخصت کرنے کے لئے صدہا احباب تشریف لائے مندرجہ ذیل احباب قابل ذکر ہیں۔ برادرم (سید ابوالحسنات محمد احمد قادری) خطیب مسجد وزیر خان، برادرم مولانا منور علی صاحب، مولانا سید مبارک علی خان، بھائی چنن دین (مالک صابری پریس)، بھائی سراج الدین اشرفی، بھائی احمد علی، حافظ مظہر الدین، مولوی محبوب عالم، مولوی غلام دین، مولوی احمد علی شمیم، حاجی شمس الدین، مستری فیروز دین نے باکمال محبت وشفقت و دلیل ہمدردی وخلوص کے ساتھ رخصت کیا۔ بڑے بھائی صاحب (علامہ ابوالحسنات) سہارنپور تک میرے ساتھ آئے اس وقت رات کے تین بجے تھے۔

وہاں سے تین بجے کی ٹرین سے بھائی صاحب دہلی روانہ ہوئے اور ہم مرادآباد۔

صبح آٹھ بجے مرادآباد اسٹیشن پر پہنچے مرادآباد سے کلکتہ کا ٹکٹ ۹ روپے تین آنے میں لیا۔ حضرت صدر الافاضل مع مولوی محمد یونس اور مولوی مسعود احمد دہلوی انٹر میں تھے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء بروز اتوار کلکتہ اسٹیشن پر پہنچے تو کثیر جماعت اشرفیہ نے استقبال کیا۔ چار روز کلکتہ میں قیام رہا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۶ء جہانگیری جہاز میں سوار ہوئے۔ قبلہ مرشدی کو کرسی پر بٹھا کر جہاز پر لایا گیا۔ وہ منظر قابل دید تھا۔ جماعت اشرفیہ اپنے مرشد کی زیارت سے فیض یاب ہو رہی تھی۔ مخدوم زادہ محمد میاں بھی کلکتہ بلائے گئے تھے بوقت رخصت تاب ضبط گریہ نہ کر سکے۔ حضرت نے بے حد تسلی آمیز کلمات تلقین کیے۔ حضرت پیر و مرشد کے ساتھ حافظ محمد ابراہیم اچھے میاں صاحب اور محدث صاحب تھے۔ جہاز دو میل فی گھنٹہ طے کرتا تھا۔ حاجی عبدالعزیز کا جہاز کی انتظامیہ پر بہت اثر ہے وہ تمام راستے حضرت پیر و مرشد اور ان کے ہمراہی علماء مشائخ کو سہولتیں پہنچاتے رہے۔ جہاز میں سواری کے وقت طوفان نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں بیٹھے ہیں۔ مگر ۳ فروری ۴ بجے دن کے تخت طوفان آیا۔ حضرت پیر و مرشد نے دعا کی۔ طوفان تھا۔ ایک مچھلی وزن دس سیر سمندر

کے پانی سے اُچھل کر جہاز میں آگری۔ ایک مچھلی جس کے دو پر ہیں سینہ سفید ہے اور باقی کالی ہے وہ سمندر کے پانی سے نکل کر پرواز کرتی ہے۔ پھر غوطہ لگاتی ہے۔ قدرت خداوندی کے مناظر نظر آرہے ہیں۔ طوفان تو کئی بار آئے مگر تھم گئے۔ لیکن ۱۳ فروری یلملم کے قریب صبح سے غیر معمولی طوفان سے جہاز ہچکولے کھا رہا ہے۔ حضرت صدر الافاضل مدظلہ العالی اشعار ذیل پڑھنے لگے۔

قلزم اس جوشِ طلاطم سے ڈراتا ہے مجھے
جان کا خطرہ تو ہرگز نہیں آتا ہے مجھے
اپنی محرومی کا اندیشہ ستاتا ہے مجھے
المدد اے میری سرکار مدینے والے
آپ سے کرتے ہیں فریاد سفینے والے

حضرت اچھے میاں صاحب کی عجیب کیفیت ہے۔ کبھی بارگاہ نبوی ﷺ میں درود وسلام عرض کرتے ہیں اور کبھی اذان شروع کر دیتے ہیں۔ اتنے میں جہاز کے کپتان نے حضرت پیرومرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی استدعا کی۔ آپ نے فرمایا جہاز کے اوپر عرشے پر جا کر تین دفعہ پکارو بدر پھٹ، بدر پھٹ، بدر پھٹ، ایسا کہا گیا کہ یکا یک طوفان تھما اور فضا سازگار ہوگئی۔ دوران سفر روزانہ تہجد کی نماز ہوتی تھی۔ نماز کے بعد بہ حضور سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بصد ادب و نیاز "صلوٰۃ وسلام" عرض کیا جاتا ہے۔ جہاز میں مختلف مقامات پر وعظ ہوتے ہیں۔ آج حضرت محدث صاحب نے مناسک حج بیان فرمائے اور مولوی مسعود احمد خان دہلوی نے درس قرآن دیا۔

عجیب سماں ہے سب کے دل محبوب خدا کے عشق ومحبت سے مخمور ہیں۔ پیرومرشد کی معیت ہے آپ حضرت مولانا محمد عالم آسی کی نعت سنا رہے ہیں

اخیر عمر ہے آسی چلو مدینے کو
نثار ہو کے مرو تربت پیمبر پر

دربار خداوندی میں حاضری مناسب حج کی ادائیگی اور دربار نبوت میں باریابی کی تمنائیں لئے یہ قافلہ "جہانگیری جہاز" پر رواں دواں ہے۔

کبھی تو جاگے گی میری قسمت کبھی تو میرا سلام ہوگا"

(حضرت سیّد ابوالبرکات کی ذاتی ڈائری سے)

مملکت خداداد پاکستان کے قیام کے بعد "سنی کانفرنس" کے تاریخی تسلسل کو نیا عنوان دینے کے لئے 28 مارچ 1948ء کو جب حضرت سیدنا امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ملک بھر کے اکابر علماء ومشائخ کا نمائندہ اجلاس مدینۃ الاولیاء ملتان شریف میں طلب کیا تو سید صاحب نے اس میں خصوصی طور پر شرکت فرمائی اس تاریخ ساز اجلاس میں "جمعیت علماء پاکستان" کی بنیاد رکھی گئی آپ کے بڑے بھائی حضرت علامہ سیّد ابوالحسنات محمد احمد قادری مرکزی صدر اور سیّد کاظمی بلحاظ ناظم اعلیٰ چنے گئے۔

1949ء میں جب ملک میں پہلی دستور ساز اسمبلی قائم ہوئی تو آپ نے مجاہد ملت علامہ عبدالحامد بدایونی کی سرکردگی میں قرارداد مقاصد کی ترتیب میں بھرپور حصہ لیا۔

تحریک ختم نبوت 1953ء کے زمانے میں پاکستان کے اولین اور سخت گیر مارشل لاء کی پابندیوں کو آپ نے ہمیشہ جوتے کی نوک پر رکھا اور کھل کر مارشل لاء کی مخالفت کی۔ مارشل لاء حکام نے جب لاؤڈ اسپیکر پر پابندی عائد کی تو سب سے پہلے آپ نے اس پابندی کو توڑا۔ آپ عین وسط شہر میں واقع دارالعلوم حزب الاحناف میں روزانہ بعد نماز فجر قادیانی فتنہ کے خلاف لاؤڈ اسپیکر پر دھڑلے سے تقریر کرتے رہے لیکن کسی مائی کے لعل کو سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ روزانہ قادیانی مبلغین کے لچر اور بیہودہ سوالات کے انتہائی سنجیدہ اور مسکت جوابات دیتے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ کی علمی انداز سے پرزور تائید فرماتے۔

1965ء میں "عائلی قوانین" کی خلاف شرع دفعات کے خاتمہ کے لئے ممتاز عالم دین حضرت مولانا محمد بخش مسلم بی۔اے، خطیب پاکستان مولانا غلام دین اور آستانہ عالیہ آلومہار

شریف کے سجادہ نشین حضرت صاحبزادہ فیض الحسن کے ساتھ آپ نے صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان سے ان کی لاہور آمد کے موقع پر گورنر ہاؤس لاہور میں ملاقات کی۔ صدر ایوب نے جب آپ سے دعا کی درخواست کی تو آپ نے حق گوئی کا حق ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ صدر صاحب آپ نے خلاف شرع عائلی قوانین نافذ کئے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے ایک بت پرست بھارتی وزیراعظم شاستری کی ارتھی کو کندھا دیا ہے۔ میں آپ کے لئے کیسے دعا کر سکتا ہوں۔ آپ کے اس بے لاگ اور کھرے جواب سے شرمندہ ہو کر صدر ایوب نے جواب دیا کہ بھارتی وزیراعظم شاستری کی ارتھی کو کندھا دینا ایک رسمی چیز ہے۔ مجھے مجبوری میں ایسا کرنا پڑا اور عائلی قوانین میں ترمیم کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔

1969ء میں جب محکمہ اوقاف کے ایک افسر ''مسعود بھگوان'' نے اُردو میں نماز پڑھنے کا شوشہ چھوڑا تو اکتوبر 1969ء آپ نے لاہور میں ایک زبردست احتجاجی جلوس نکال کر مسعود بھگوان کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا۔ جلوس میں پنجاب کے اکثر علماء اور خانقاہوں کے سجادہ نشین حضرات آپ کے ساتھ شریک تھے۔ جس کے باعث مسعود بھگوان کا فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔ الغرض آپ نے محراب و منبر کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ آپ کی ساری زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ آپ نے ہر مشکل وقت میں قوم کی راہنمائی کا فریضہ انتہائی احسن طریقہ سے انجام دیا اور آنے والے رہنمایانِ قوم کے لئے عملی نمونے چھوڑے۔

اوائل ستمبر 1978ء تک 82 سال بزرگ ہونے کے باوجود آپ وضو خود کر لیا کرتے تھے اور نماز باجماعت کی امکانی حد تک کوشش کیا کرتے۔ جب انتہائی نقاہت کے باعث مسجد تک نہ چل سکتے تو گھر پر ہی دو چار احباب کو اور اگر کوئی نہ ہوتا تو صاحبزادوں اور پوتوں کو ساتھ ملا کر جماعت کا ضرور بالضرور اہتمام فرماتے اور اس (آخری) سال بھی آپ نے رمضان شریف کے روزے ڈاکٹروں کے کہنے کے باوجود نہ چھوڑے۔

19 ستمبر 1978ء کو آپ کے فرزند اکبر حضرت شارح بخاری علامہ محمود احمد رضوی

نے حال پوچھا تو فرمایا ''اللہ کا شکر ہے مگر ہم چند دن کے مہمان ہیں''۔ آپ کے اس جواب پر علامہ رضوی کو ضبط کا چارہ نہ رہا اور آنسو چھلک پڑے تو فرمایا۔ یہ دن تو سب کو دیکھنے پڑتے ہیں اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ہاں یاد رکھنے کی باتیں یہ ہیں ''(۱) اہل سنت کے مسلک پر قائم رہنا۔ (۲) شریعت کی پابندی کرنا۔ (۳) اپنی اولاد کو دین کا علم سکھانا۔ (۴) دارالعلوم حزب الاحناف تمہارے پاس امانت ہے اس دینی ادارے کی تعمیر و ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا۔ (۵) دین اسلام کی تبلیغ میں کوتاہی نہ کرنا''۔

آخر 20 شوال 1398ھ بروز اتوار بمطابق 24 ستمبر 1978ء چار بج کر دس منٹ پر رضویت کا یہ آفتاب اور اشرفیت کا یہ مہتاب ہمیں بے علمی اور بے عملی کے اس ماحول میں روتا چھوڑ کر فی جنت النعیم چلا گیا۔

پیر 25 ستمبر کو سلسلہ عالیہ اشرفیہ پاکستان کے امیر حضرت صاحبزادہ ڈاکٹر سید مظاہر اشرف جیلانی کی امامت میں مینار پاکستان کے وسیع میدان میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جنازے کا یہ اجتماع غازی علم دین شہید اور حکیم الامت علامہ اقبال کے جنازوں کی طرح لاہور کا تاریخی اجتماع تھا۔ جس میں ہر شعبہ زندگی کے افراد نے شرکت کرنا اپنے لئے ایک اعزاز سمجھا۔ اسی شام حزب الاحناف کی نئی عمارت گنج بخش روڈ پر تدفین عمل میں آئی اور آج تک آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کے مزار مبارک کی خاص بات یہ ہے کہ ملک بھر کے علاوہ ایران، افغانستان، وسطی ایشیاء، عرب ممالک، یورپ، امریکہ، بھارت، بنگلہ دیش اور دنیا کے دیگر خطوں سے مختلف سلاسل کے جو بھی مشائخ، علماء، زائرین اور خوش عقیدہ سیاح حضرت داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ کے مزار شریف پر حاضری کے لئے آتے ہیں وہ آپ کے مزار پر بھی ضرور حاضری دیتے ہیں۔

تحفظ ختم نبوت کی قانونی جنگ کے مجاہد اوّل

حضرت امام احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ

بابائے غلط بیانی مرزا غلام قادیانی آنجہانی کے دعوائے نبوت کے ساتھ ہی اہل اسلام نے اس کا شدید زبانی وقلمی رد شروع کر دیا تھا اور اس عمل میں تمام چھوٹے بڑے مسلم رہنما شامل تھے خاص طور پر اتر پردیش میں امام احمد رضا اور ان کے بڑے بیٹے مولانا حامد رضا، مشرقی پنجاب میں مولانا نواب الدین رمداسی، مغربی پنجاب میں مولانا غلام قادر بھیروی اور شمالی پنجاب میں پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

قیام پاکستان سے قبل یہ نظریاتی جنگ مناظروں، کتابوں، رسائل اور اخبارات کے محاذ پر لڑی جا رہی تھی۔

حضرت امام احمد سعید کاظمی امروہہ سے پڑھ کر نئے نئے فارغ ہوئے تھے اور اسلام کے پرجوش مبلغ تھے۔ اس دور میں آپ ایک ہندو پنڈت سے "سات جنم" کے موضوع پر مناظرہ جیت چکے تھے اور شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ایک روز آپ قادیان جا پہنچے اور قادیانیوں کے مبلغین سے مناظرہ کر کے انہیں ان کے گھر میں شکست سے دوچار فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ابھی میں کمسن تھا اور میری داڑھی بھی نہیں اتری تھی کہ میں قادیان گیا اور قادیانی علماء سے مناظرہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک مکان بنایا۔ فاکملھا فاحسنھا۔

اس نے اسے مکمل اور حسین بنایا مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی لوگ اس

گھر میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے حسن تعمیر پر تعجب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاش یہ اینٹ کی جگہ خالی نہ ہوتی۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں وہی اینٹ ہوں۔ میں نے قادیانی علماء سے پوچھا کہ نبوت کی عمارت میں فقط ایک اینٹ کی گنجائش تھی جسے حضور سید عالم ﷺ نے پُر کیا اب تم بتاؤ کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کہاں ڈالو گے؟

وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ان میں سے ایک بولا۔ عزیز بات یہ ہے کہ جب عمارت بنائی جاتی ہے تو اس کا پلستر بھی کیا جاتا ہے تو ہم مرزا صاحب کا پلستر کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ تم مرزا صاحب کا پلستر نہیں کر سکتے سرکار ﷺ نے فرمادیا فاکملھا بنانے والے نے عمارت کو مکمل کر دیا اور پلستر کے بغیر عمارت مکمل نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک اور نے ہمت کی اور کہنے لگا کہ دیکھو۔ عزیز ٹھیک ہے کہ پلستر کے بغیر عمارت مکمل نہیں ہوتی مگر عمارت کا رنگ و روغن بھی تو کیا جاتا ہے۔ تو ہم مرزا صاحب کا رنگ و روغن کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ تم مرزا صاحب کا رنگ و روغن بھی نہیں کر سکتے کیونکہ میرے آقا ﷺ نے فرمادیا ہے فاحسنھا کہ بنانے والے نے عمارت کو حسین وجمیل بنادیا اور عمارت کا حسن رنگ و روغن سے ہی ہوتا میرے اس استدلال نے ان کا ناطقہ بند کر دیا" (مفتی محمد ابراہیم، ماہنامہ السعید، شمارہ خاص امام اہل سنت نمبر 2000)

قیام پاکستان کے بعد قانونی محاذ پر تحفظ ختم نبوت کی جنگ حضرت امام احمد سعید کاظمی نے شروع کی۔ جبکہ آپ پاکستان مسلم لیگ صوبہ پنجاب کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ 1952ء کو مسلم لیگ صوبائی کونسل کے اجلاس میں آپ نے یہ مسئلہ اُٹھایا۔ اور بڑی شدومد کے ساتھ یہ قرارداد منظور کرائی۔ کہ قادیانیوں کو کافر مرتد قرار دیا جائے اور انہیں کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے۔ یہی وہ نقطہ آغاز تھا جس کی بنا پر اہل سیاست وحکومت تک یہ موثر آواز پہنچی اور بالآخر 22 سال کی جدوجہد کے بعد 1974ء میں قادیانی کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے کافر اور مرتد قرار

دیا۔قومی اسمبلی میں یہ تحریک مولانا شاہ احمد نورانی نے پیش کی اور بھاری اکثریت سے منظور کرائی۔ البتہ دیو بندی فرقے کے دو ممبران اسمبلی غلام غوث ہزاروی اور عبدالحکیم نے اس قرارداد کی تائید و حمایت نہ کی۔

خانیوال کے مولانا محمد حنیف اختر مدظلہ اپنی کتاب ''گلدستہ تقاریر'' کے صفحہ پر لکھتے ہیں۔

''جسٹس منیر انکوائری رپورٹ صفحہ ۹۷ میں یہ تحریر موجود ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی سب سے پہلی قرارداد مسلم لیگ کی صوبائی کونسل کے اجلاس میں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب نے پیش کی تھی''۔1952ء میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے کس اجلاس میں آپ نے جو قرارداد پیش کی۔اُس قرارداد میں مسلم لیگی اکابرین سے کہا گیا تھا۔کہ وہ قادیانیت کے مضمرات اور ان کی اسلام دشمن کاوشوں سے باخبر رہیں۔اور انگریز کے پیدا کئے ہوئے اس فتنے کے استیصال کے لئے تمام صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔اس قرارداد کا مقصد یہ تھا کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنا ہے تو ہمیں عظمت رسول ﷺ کو ہر پہلو سے مقدم رکھنا ہوگا۔اسلام حضور ﷺ کی ذات اقدس سے عبارت ہے۔ اور آپ کی ختم نبوت کا مسئلہ حل کئے بغیر ملک میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔1953ء میں جب تحریک تحفظ ختم نبوت نے زور پکڑا اور اس میں بہت سے مسلمانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔تو حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جمعیت علمائے پاکستان کے ناظم اعلیٰ تھے اور حضرت قبلہ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ اس کے صدر تھے اس موقع پر مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لئے ایک تنظیم ''متحدہ مجلس عمل'' تشکیل دی گئی جس کے امیر متفقہ طور پر حضرت علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ چنے گئے۔اس تنظیم نے وہ تمام نکات بطور قرارداد منظور کر لئے جو حضرت قبلہ غزالی زماں اس سے پہلے مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں پیش کر چکے تھے جن میں دیگر مطالبات کے ساتھ یہ تین اہم مطالبے بھی شامل تھے۔

(۱) مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔(۲) چوہدری میر ظفر اللہ کو جو قادیانی ہے وزیر خارجہ کے عہدے سے ہٹایا جائے۔(۳) قادیانیوں کو ملک کے تمام اہم کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے۔

امام اہل سنت نے اس تحریک کے دوران جگہ جگہ دورے کئے اور متعدد جلسوں سے خطاب کیا آپ کی خطابت انگریز کے خود کاشتہ پودے قادیانیت کی سرکوبی کیلئے وقف تھی۔غرضیکہ حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے بانی ہیں اور آپ کا یہ عظیم کارنامہ تاریخ کے صفحات پر رقم ہے اور ہمیشہ ہمیشہ آفتاب نیم روز کی طرح درخشاں رہے گا''۔(گلدستہ تقاریر، مطبوعہ صراط مستقیم پبلی کیشنز)

روزنامہ نوائے وقت لاہور اپنی 8 ستمبر 2005ء کی اشاعت میں ادارتی صفحہ پر قمطراز ہے''50 کی دہائی کے شروع میں جب قادیانی شتر بے مہار بنے اور اسلام و پاکستان کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے لگے تو اہل ایمان عشق رسول ﷺ کے جذبہ سے سرشار ہو کر تن من دھن کی بازی لگانے کیلئے میدان عمل میں اتر پڑے۔1952ء میں مسلم لیگ صوبہ پنجاب کی مجلس عاملہ کے رکن حضرت امام احمد سعید کاظمی نے مسلم لیگ کے اجلاس میں قادیانیوں کے خلاف سب سے پہلی قرارداد منظور کروائی اور قادیانیوں کو ملک کے اہم اور کلیدی عہدوں سے ہٹانے کا مطالبہ کیا''۔ (ماہنامہ کنزالایمان، لاہور ستمبر 2007ء۔ بشکریہ نوائے وقت لاہور، 8 ستمبر 2005)

ختم نبوت کے حوالے سے صادق علی زاہد نے سوالاً جواباً ''عقیدۂ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت'' کے نام سے ایک بہت قیمتی اور معلومات افزا کتاب مرتب کی ہے آپ اس کتاب کے صفحہ 116 (طبع جدید) پر لکھتے ہیں۔

سوال: کس بزرگ عالم دین نے پنجاب مسلم لیگ کے اجلاس میں قرارداد پیش کی تمام قادیانیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کی غرض سے ظفر اللہ خاں کو اُس کے عہدے سے ہٹایا

جائے۔

جواب: علامہ سید احمد سعید کاظمی ممبر مجلس عاملہ صوبائی مسلم لیگ

(بحوالہ منیر انکوائری، رپورٹ، ص ۹۷)

غزالی زماں رازی دوراں رحمہ اللہ تعالیٰ نے عمر بھر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور رد قادیانیت کے سلسلے میں نہایت اہم خدمات سرانجام دیں۔ غزالی زماں رازی دوراں رحمہ اللہ تعالیٰ نے 11 جون 1952ء کو صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں پیش کرنے کیلئے ایک قرارداد بھیجی جس پر خواجہ عبدالحکیم صدیقی صدر سٹی مسلم لیگ ملتان اور صوفی عبدالغفور لدھیانوی آفس سیکرٹری مسلم لیگ ضلع ملتان نے تائیدی دستخط کئے تھے۔

قرارداد کے الفاظ یہ تھے:

☆ کہ قادیانی بالاتفاق خارج از اسلام سمجھے جاتے ہیں اس لئے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور حکومت کو اس اعلان میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

☆ چونکہ چوہدری ظفر اللہ (اس وقت کے وزیر خارجہ) قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہیں۔

☆ صوبہ پنجاب کی مسلم لیگ کونسل کو حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ انہیں اپنے عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔ پاکستان کی سیاسی و تہذیبی زندگی کے مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر یہ قرارداد اس وقت منظور کر لی جاتی تو قادیانیت کا مسئلہ اس وقت حل ہو جاتا اور قادیانی عناصر بعد کے ادوار میں جس طرح قوت پکڑ کر اس مملکت خداداد کو نقصان سے دوچار کیا وہ پیش نہ آتے۔ مگر افسوس کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی پیش کردہ اس قرارداد کو مسلم لیگی زعماء نے خاطر خواہ پذیرائی نہ بخشی اس سے آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ مسلم لیگ وہ نہیں رہی جو حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں اسلامی نظام کے نفاذ کا پروگرام لے کر چلی تھی۔

(حیات غزالی زماں: مصنف حافظ امانت علی سعیدی، ص ۶۳، مطبوعہ ختم نبوت فاؤنڈیشن، کاہنہ نو،

لاہور، بحوالہ سردار محمد اکرم بزمی، ماہنامہ السعید)

1953ء میں سیالکوٹ کے ایک مضافاتی علاقے ''ملکے کملاں'' میں مرزائیوں کا کافی زور تھا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ علاقہ مرزائی اسٹیٹ بنا ہوا تھا اور یہاں پر مرزا قادیانی کو ''حضرت صاحب'' کے علاوہ پکارنا جرم تھا۔

حضور غزالی زماں کو اس بات کا علم ہوا تو آپ کو بڑا دکھ ہوا آپ نے اس علاقے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ''جلسہ ختم نبوت'' رکھوایا جس میں خطاب کرنے کے لئے آپ خود تشریف لے گئے۔ جلسہ میں مقامی علماء میں سے ایک مولانا صاحب نے تقریر شروع کی تو ایک مرزائی چوہدری ریوالور اُٹھائے جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ اور ریوالور تان کر کہا۔ مولوی صاحب جو تقریر کرنا چاہو کرو لیکن ہمارے مرزا صاحب کے خلاف کوئی بات نہ کرنا ورنہ تمہارا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ وہ مرزائی چوہدری علاقے میں ایک مشہور بدمعاش کے طور پر مانا جاتا تھا۔ اس نے جب بھرے مجمع میں یہ دھمکی دی تو تقریر کرنے والے مولانا صاحب کی قوت گویائی جواب دے گئی اور وہ اِدھر اُدھر کی باتوں سے مجمع کو بہلانے لگا۔

حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ منظر دیکھا تو برداشت نہ کر سکے اور مولانا کی تقریر بند کرا کے خود اسٹیج پر تشریف لائے اور مختصر عربی خطبہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمانو! پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنو۔ یہ میرے اور آپ کے ایمان کا مسئلہ ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جو شخص بھی حضور نبی کریم ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے وہ کافر، مرتد اور بے ایمان ہے۔ اسی لئے مرزا قادیانی بھی کافر اور مرتد ہے اور جو اس کا کافر مرتد نہ سمجھے وہ بھی کافر اور قطعی کافر ہے۔

اس عقیدے کے بیان کرنے پر چوہدری مجھے گولی مارنا چاہتا ہے تو احمد سعید کاظمی کا سینہ حاضر ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا سینہ ننگا کر کے فرمایا۔ مار گولی میں دیکھتا ہوں کہ تو کتنا بہادر ہے۔ تیرا گرو تو بہت بزدل تھا۔ تو کہاں سے بہادر نکل آیا ہے۔ تیرا مرزا خبیث انگریز کا پٹھو اور

اس کا ٹوڈی تھا۔ تم بھی اس کے ٹوڈی ہو۔ انگریز کے جوتے چاٹ چاٹ کر دنیا بناتے اور ایمان گنواتے ہو۔

پھر فرمایا کہ "کیا ہم ٹوڈی اور انگریزی نبی کو مانیں" حاضرین بولے۔ نہیں نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ قرآن وحدیث اور اجماعِ اُمت سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ ہمارے آقا ومولیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ عزوجل کے آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، کذاب اور بے ایمان ہے۔ مسلمانو! اپنے ایمانوں کو بچاؤ۔

حضور امام اہل سنت کاظمی سرکار رحمۃ اللہ علیہ نے جس جرأت سے یہ تقریر فرمائی یہ صرف آپ ہی کی شان تھی ورنہ ایسے موقعوں پر بڑے بڑے کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ آپ جب دلائل وبراہین کے ساتھ مرزائیوں پر برسنے لگے تو اس مرزائی چوہدری کے ہاتھ لٹک گئے اور لوگوں نے اُسے پکڑ لیا اور اس کی ساری چوہدراہٹ خاک میں ملا دی۔

آپ کے خطاب کی تاثیر سے کئی مرزائی آپ کے دستِ اقدس پر تائب ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے اور اب اُس علاقے میں کوئی مرزائی نظر نہیں آتا۔ (گلدستہ تقاریر، صراط مستقیم پبلی کیشنز)

جنوبی پنجاب میں فکر رضا کے پہلے ترجمان

حضرت امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

امام احمد رضا کے عشق واخلاص نے ایک جہان کو متاثر کیا۔ آپ کے عقیدت مندوں میں جہاں عامۃ الناس شامل ہیں وہیں بڑے بڑے اہل اللہ۔ شریعت وطریقت کے شہسوار اور وارثانِ محراب ومنبر بھی آپ کی محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے عاشق صادق ہیں اور جو بھی آپ سے پیار کرتا ہے اسی نسبت کے باعث کرتا ہے۔

آج ہم اس تحریر کے ذریعے حضرت سیدنا امام احمد سعید کاظمی چشتی صابری علیہ الرحمۃ کی اعلیٰ حضرت سے محبت کا جائزہ لے رہے ہیں۔ آپ ساداتِ امروہہ کے چشم وچراغ، سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ کے شیخ کامل، اہل سنت کے جید عالم دین اور جنوبی پنجاب میں "فکر رضا" کے پہلے ترجمان تھے۔ ظاہری وباطنی علوم کی تکمیل اور سلوک کی منازل طے کرنے کے بعد بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں آپ لاہور تشریف لائے کچھ عرصہ انجمن نعمانیہ کے دار العلوم میں تدریس فرمائی پھر اوکاڑہ میں کچھ عرصہ درس وتدریس میں مشغول رہے اور بالآخر ملتان میں ڈیرے ڈال لئے۔

حضرت مولانا حافظ امانت علی سعیدی اپنی تصنیف لطیف "حیات غزالی زماں" کے گیارھویں باب کے صفحہ نمبر 45 پر لکھتے ہیں۔ غزالی زماں رازیٔ دوراں امام احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ کو سیدنا اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجدد دین وملت مولانا الشاہ امام احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ سے بڑی گہری محبت تھی بلکہ غزالی زماں رازیٔ دوراں مسلکِ اعلیٰ حضرت کے عظیم مبلغ تھے۔ بچپن میں قیام پاکستان سے قبل جبکہ غزالی زماں رازیٔ دوراں امروہہ میں ہی رونق افروز تھے، اپنے مرشد برحق واستاد محترم حضرت علامہ السید الشاہ محمد خلیل کاظمی محدث امروہوی کے

ہمراہ ایک بار امام اہل سنت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک میں حاضر ہوئے اور خانقاہ عالیہ رضویہ کی بالائی منزل پر جلسہ تھا۔ ہزاروں علماء ومشائخ اہل سنت تشریف لائے ہوئے تھے اور وقفہ وقفہ سے تقریر کر رہے تھے۔

شہزادہ اعلیٰ حضرت امام العلماء سیدنا حضرت مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی قدس سرہ العزیز اپنے کاشانہ اقدس کے باہر رضوی دارالافتاء میں رونق افروز تھے۔ علامہ کاظمی کے خطاب کی باری آئی اور حضرت علامہ کاظمی نے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے تجدیدی کارناموں پر فصیح وبلیغ اور جامع تقریر شروع فرمائی، دارالافتاء میں تقریر کی آواز پہنچ رہی تھی، شہزادہ اعلیٰ حضرت سرکار مفتی اعظم نے اظہار مسرت کے ساتھ تقریر کی جامعیت اور قوت استدلال کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا امروہہ کے چھوٹے شاہ صاحب تقریر کر رہے ہیں ماشاء اللہ خوب فصاحت وبلاغت ہے بہت اچھا مطالعہ ہے اللہ برکت دے۔ (حیات غزالی زماں، ص ۴۵)

1945ء میں باقاعدہ ایک مدرسہ قائم کیا جو انوار العلوم کے نام سے موسوم ہے۔ ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر 7 سے 14 جون 1945 کے شمارے میں آپ نے ایک اشتہار شائع کروایا جو امام احمد رضا سے آپ کی قلبی وابستگی کی روشن دلیل ہے۔

''دو مستند مدرس عالموں کی ضرورت ہے جو اول سے آخر تک کی تمام کتب درسیہ بخوبی پڑھا سکیں اور حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عقیدہ ہوں۔ تنخواہ ہر مدرس کو سو روپیہ ماہوار دی جائے گی کھانے اور رہائش کا بھی معقول انتظام کیا جائے گا۔ سید احمد سعید کاظمی امروہوی مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم متصل چوک چہلیک کچہری روڈ، ملتان''۔

یہ اعلیٰ حضرت کی محبت وعقیدت ہی کا کرشمہ تھا کہ حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مدرسہ انوار العلوم میں ہر سال ''یوم رضا'' کی تعطیل منظور کی ہوئی تھی۔ آپ نے مدرسہ انوار العلوم میں یوم رضا کی تقریب کا بزم سعید کی طرف سے باقاعدہ انتظام فرمایا اور اب بھی جامعہ انوار العلوم میں یوم رضا کی بابرکت روحانی تقریب ہر سال باقاعدہ منائی جاتی ہے۔ جب آپ نے انوار العلوم میں یوم رضا شروع فرمایا اور اعلیٰ حضرت کی عظیم وجلیل شخصیت مقدسہ پر خطاب فرمایا تو آپ پر ایک خاص روحانی وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور بے خودی کے عالم میں بچشم

اشک بار خطاب فرمایا جس کی تفصیل اس زمانہ کے ماہنامہ السعید میں شائع ہوئی تھی۔

پاکستان کے معروف رضوی سکالر حضرت مولانا حسن علی رضوی مدظلہ راوی ہیں کہ ملتان کے علاقے ''حسین آگاہی'' میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کا ایک جلسہ انتظامیہ کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ دیوبندی مقرر محمد علی جالندھری نے جوش خطابت میں کہیں کہہ دیا کہ میں لوہے کی لٹھ دیوبندی ہوں۔ جب حضرت خطاب کیلئے تشریف لائے تو آپ نے بڑے معنی خیز انداز میں فرمایا لٹھ مونث ہوتی اور پتھر مذکر ہوتا ہے۔ میں پتھر کی طرح سخت بریلوی ہوں اور لوہا تو پگل بھی جاتا ہے مگر پتھر نہیں پگھلتا۔

اعلیٰ حضرت کے چھوٹے شہزادے حضرت مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید سعید حضرت مولانا انوار احمد رضا لکھتے ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کاظمی صاحب قبلہ مسلک اعلیٰ حضرت کے عظیم ناشر ومبلغ تھے۔ اعلیٰ حضرت کی تصانیف اور تحقیق پر معاندین ومخالفین کی طرف سے اعتراضات کا جس طرح دفاع حضور غزالی دوراں فرماتے ہیں وہ انہی کا خاصہ تھا۔ میرے پیرومرشد شیخ الشیوخ العالم حضور سیدنا مفتی اعظم قطب عالم مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خان صاحب نوری بریلوی سجادہ نشین خانقاہ عالیہ بریلی شریف نے نہ صرف غزالی زماں کو سلسلہ عالیہ قادریہ رضویہ کی اجازت عطا فرمائی تھی بلکہ سند حدیث شریف بھی عطا فرمائی تھی اور حضرت غزالی زماں کے عہد حیات میں مدرسہ انوار العلوم سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کو جو سند دی جاتی تھی اس میں حضور سیدنا مفتی اعظم مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خان صاحب اور اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے توسط سے یہ سند شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک جاتی ہے۔ ایسے بہت کم خوش نصیب لوگ ہیں جن کو سیدنا مفتی اعظم نے بیک وقت سلسلہ عالیہ کی اجازت اور حدیث پاک کی سند عطا فرمائی ہو''۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے خلیفہ اور روزنامہ نوائے وقت کے خاص قلمکار خواجہ ڈاکٹر عابد نظامی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ (مشہور شاعر) میر حسان الحیدری کے ساتھ حضرت امام احمد سعید کاظمی کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے فرمایا: نعت گو شعراء کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی ''حدائق بخشش'' بار بار پڑھنی چاہئے۔ اعلیٰ حضرت کی نعتوں میں بارگاہ رسالت پناہ کا جو ادب واحترام ہمیں ملتا ہے اور جو احتیاطیں نظر آتی ہیں وہ دوسرے شاعروں کے

ہاں بہت کم نظر آتی ہیں، اعلیٰ حضرت مقام نبوت اور نبوی جلالت شان کے شناسا ہیں۔ اس شناسائی اور معرفت کے بغیر نعت لکھنی ممکن نہیں۔ یہ شناسائی حضور پر نور ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطالعہ اور کثرت سے درود شریف پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

بھارت کے شہر ممبئی سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''افکار رضا'' جون 1999ء میں برصغیر کے معروف دانشور سید صابر حسین بخاری رقمطراز ہیں۔

''قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عاشق زار تھے، جب بھی کسی نے اعلیٰ حضرت کی شخصیت کو داغدار کرنے کی ناپاک جسارت کی تو آپ کا راہوار قلم فوراً تعاقب میں سرپٹ دوڑتا بالآخر معترض کو راہ فرار اختیار کرنی پڑتی''۔

حضرت سید امام احمد کاظمی زمانہ طالب علمی ہی سے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کمال درجہ متاثر تھے۔ ''السبحان السبوح'' اعلیٰ حضرت کی شہرہ آفاق علمی تحقیقی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ سبوح وقدوس پر کذب کے امکان کا اطلاق کرنے والوں کا رد بلیغ ہے۔ امام کاظمی نے حضور اعلیٰ حضرت کی یہ کتاب ملاحظہ فرمائی تو اعلیٰ حضرت کی اتباع میں اسی رنگ میں امکان کذب کے حاملین کے رد میں ''تسبیح الرحمٰن'' نامی فاضلانہ کتاب تصنیف فرمائی۔ یہ امام کاظمی کا نقش اول ہے۔ جو فراغت کے بعد عالم شباب میں تصنیف فرمائی۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت نے شان الوہیت میں تنقیص اور شان رسالت میں توہین کی ناپاک جسارت کرنے والے قادیانی نانوتوی، گنگوہی، انبیٹھوی، تھانوی وغیرہ پر اکابر علمائے حرمین سے تکفیر کا حکم شرعی حاصل کیا اور اس کو حسام الحرمین کے نام سے شائع کیا۔ پھر اعلیٰ حضرت کے وصال شریف کے بعد شیر بیشہ اہل سنت مولانا محمد حشمت علی خاں لکھنوی نے ہندوستان بھر کے علماء و مشائخ سے حسام الحرمین پر تائید و تصدیق حاصل کی تو امام کاظمی اور آپ کے پیرومرشد حضرت علامہ سید محمد خلیل خاں کاظمی محدث امروہوی نے تکفیر کے شرعی حکم کی بھرپور تائید و تصدیق فرمائی اور شریعت کے اصولوں کے مطابق گستاخان رسول اللہ ﷺ کے خلاف فتویٰ دیا۔ امام کاظمی کا یہ قدیم فتویٰ الصوارم الہندیہ صفحہ نمبر ۱۰۲ پر موجود ہے۔

ملتان کے دیوبندی ماہنامہ ''الصدیق'' نے ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ میں امام اہل سنت سیدنا اعلیٰ حضرت کی مشہور کتاب ''الامن والعلیٰ'' میں منقول ''حدیث مشورہ'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے

حبیب ومحبوب ﷺ سے آپ کی اُمت کے بارے میں مشورہ فرمایا)۔ کو جھوٹی قرار دیا حالانکہ اس وقت محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سمیت اعلیٰ حضرت کے کئی جید تلامذہ وخلفاء بھی بقید حیات تھے۔ مگر حضرت غزالی زماں نے اپنے امام ومجدد سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے تحفظ و دفاع میں جو مدلل ومحقق جواب ارقام فرمایا وہ آپ ہی کا حصہ ہے اور تحقیقات علمیہ کا اعلیٰ شاہکار ہے حضرت امام کاظمی نے یہ مبارک حدیث جو اعلیٰ حضرت نے بغیر حوالہ صفحہ محض مسند امام احمد کے نام سے نقل فرمادی تھی۔ مسند امام احمد جلد پنجم وغیرہ اور کنز الاعمال جلد ششم اور خصائص کبریٰ جلد دوئم سے حرف بہ حرف نقل فرمادی ثابت فرمادیا کہ اعلیٰ حضرت کی نقل فرمودہ حدیث مسند احمد، مطبوعہ مصر، جلد ۵، ص ۳۹۳۔ کنز الاعمال جلد ۶، ص ۲۔ خصائص کبریٰ جلد ۲ ص ۲۱۰۔ پر موجود ہے۔ اور دیگر حوالہ جات سے دشمنان اعلیٰ حضرت کا ناطقہ بند کر دیا۔ آخر میں امام کاظمی فرماتے ہیں ''الحمدللہ'' اہل علم نے دیکھ لیا کہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجدد ملت قدس سرہ العزیز علم وفضل کا وہ بحر ذخار ہیں جس کے ساحل تک بھی منکرین کی رسائی نہیں ''ذلک فضل اللہ''

مختصر یہ کہ تفسیر نیشاپوری، تفسیر سراج المنیر، تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر روح المعانی، تفسیر روح البیان اور مفردات راغب کے مدلل حوالوں سے حدیث مشورہ کا اثبات فرمایا اور ثابت فرمایا کہ حضرت امام کاظمی رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے مسلک حق کے جانثار مجاہد و محافظ ہیں۔ (نوٹ یہ کتابچہ حال ہی میں ''حدیث استشارہ'' کے عنوان سے الرضا لائبریری ریلوے پاور ہاؤس، مغلپورہ، لاہور نے شائع کیا ہے)

امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شمول الاسلام'' میں آیت **وتقلبك في الساجدين** کے تحت امام رازی علیہ الرحمۃ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کا کوئی حوالہ نہ دیا۔

امام کاظمی کے شاگرد رشید مولانا غلام رسول سعیدی دامت برکاتہم نے امام کاظمی علیہ الرحمۃ سے سوال کیا کہ حضرت! اس آیت کے تحت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ نے امام رازی کا جو حوالہ دیا ہے وہ تفسیر کبیر میں تو نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا: امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ کی تصنیف ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے یہ تفسیر نقل کی ہے اور اس کتاب کا نام ''التعظیم والمنۃ فی ان ابوی رسول اللہ فی الجنۃ'' طبع حیدرآباد دکن ص ۵۰ ہے

اس سے جہاں غزالی زماں نے اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمۃ سے اعتراض رفع کیا وہاں امام احمد رضا علیہ الرحمۃ اور امام کاظمی علیہ الرحمہ کی وسعت علمی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

دیوبندیوں نے جب امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ پر الزام لگایا کہ آپ نے قاسم نانوتوی کی کتاب تحذیر الناس کے مختلف مقامات سے تین نامکمل فقروں کو لے کر ایک فقرہ بنالیا تھا جس سے کفری مضمون پیدا ہوگیا تو حضرت علامہ سیدی احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ نے کتاب ''التبشیر برد التحذیر'' لکھ کر یہ ثابت کیا کہ امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ پہ یہ الزام قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے یہ کتاب آج تک لاجواب ہے۔

امام احمد رضا بریلوی کے مخالفین نے آپ کے ترجمہ کنزالایمان میں ''النبی'' کے ترجمہ ''غیب کی خبریں دینے والا'' پر اعتراضات کئے تو غزالی دوراں علیہ الرحمۃ نے کتاب ''النبی کا صحیح معنی ومفہوم'' لکھ کر مخالفین کا منہ بند کردیا۔

ماہنامہ ''تجلی دیوبند'' شمارہ فروری مارچ ۱۹۵۹ء اور ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور شمارہ ۸ جنوری ۱۹۶۰ء میں مخالفین اہل سنت نے حضور نبی کریم ﷺ کے جسم اقدس کا سایہ ثابت کرنے کے لئے زوردار مضامین شائع کئے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ ''**نفی الفیئ عمن بنورہ انار کل شی**'' پر بھی پھبتیاں کسی گئیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر امام کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ماہنامہ السعید ملتان کا ''ظل نمبر'' اپریل مئی ۱۹۶۰ء شائع کیا اور مخالفین کے دلائل کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس سلسلے میں ضیغم الاسلام حضور امام کاظمی رحمۃ اللہ علیہ مقالات کاظمی کی دوسری جلد کے صفحہ نمبر ۲۰۲ پر رقم طراز ہیں ''بفضلہ تعالیٰ معترضین کے تمام شکوک وشبہات کا تارعنکبوت سے زیادہ کمزور ہونا اظہر من الشمس ہوگیا اور امام اہل سنت مجدد ملت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے رسالہ مبارکہ نفی الفئی انار بنورہ کل شئی پر وارد کئے ہوئے جملہ اعتراضات ہباء منثورا ہوگئے۔ اور یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی کہ اعلیٰ حضرت کی تصانیف جلیلہ کی پھبتیاں اڑانا اور ان پر اعتراضات کرنا گویا سورج کا منہ چڑانا اور چاند پر تھوکنا ہے جس کا انجام ذلت وندامت کے سوا کچھ نہیں''۔

دارالعلوم امجدیہ کراچی میں بروز چہار شنبہ بعد نماز عشاء ۲۳ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ بمطابق ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء عرس اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ منعقد ہوا۔ عرس کے موقع پر ایک نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا۔ صدر مشاعرہ حضرت امام کاظمی علیہ الرحمہ تھے۔ نعتیہ مشاعرہ میں مصرع طرح یہ تھا۔

''ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے''

رات ڈیڑھ بجے صدر مشاعرہ امام کاظمی نے اعلیٰ حضرت کی زمین میں اپنی کہی ہوئی مندرجہ ذیل نعت سنائی۔

کیا شان شہنشاہ کونین نے پائی ہے
ختم آپ کی ہستی پر ہر ایک بڑائی ہے
ہر ایک فضیلت کے ہیں مظہر کامل وہ
کیا ذات شہ والا خالق نے بنائی ہے
کون ان کے برابر ہو کون ان کے مماثل ہو
ایسی تو کوئی ہستی آئے گی نہ آئی ہے
جنت کا خیال اب کیا آئیگا میرے دل میں
تصویر مدینے کی آنکھوں میں سجائی ہے
آزاد دو عالم ہے وہ کاظمی مسکین
آقائے دو عالم سے لو جس نے لگائی ہے

۹ جنوری ۱۹۸۰ء کو مجلس رضا کے زیر اہتمام منعقد یوم رضا کے موقع پر آپ نے جو تقریر فرمائی وہ حکیم اہل سنت حضرت حکیم محمد موسیٰ علیہ الرحمۃ کے ساتھی جناب محمد عالم مختار حق نے ''خطبات یوم رضا'' میں شائع کردی ہے صفحہ ۸ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''اعلیٰ حضرت کی مقدس شخصیت کوئی غیر معروف نہیں دنیائے علم کے آپ آفتاب اور ماہتاب ہیں۔ آپ کے مخالفین نے آپ کے علمی اور آپ کے تحقیقی مقام کو تسلیم کیا۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ کفر کا فتویٰ لگانے میں جلد بازی سے کام لیتے تھے لیکن دعوے سے کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی ایسی بات پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا جس پر کہ ان کے مخالفین اور معترضین کفر کا

فتویٰ نہ دے چکے ہوں۔ کوئی شخص قیامت تک ایسی کوئی بات ثابت نہیں کرسکتا کہ ایسی بات پر اعلیٰ حضرت نے کفر کا فتویٰ لگایا ہو جو مخالفین کے نزدیک بھی کفر نہ ہو"۔

اسی طرح آپ کی ایک دوسری تقریر "چودھویں صدی کا مجدد کون" بھی بزم عاشقان مصطفیٰ فلیمنگ روڈ، لاہور نے کتابی صورت میں چھاپ دی ہے۔ اس کے آغاز میں صفحہ نمبر ۷ پر آپ فرماتے ہیں کہ "اعلیٰ حضرت کے کارناموں کا ہم احاطہ نہیں کرسکتے۔ ان کی قابلیت ان کا تقویٰ، ان کی ذہانت، کسی ایک پر بھی گفتگو کی جائے تو ختم نہ ہو۔ اعلیٰ حضرت دنیا کے تمام علوم پر حاوی تھے۔ علوم عقلیہ ہوں یا نقلیہ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام علوم آپ کی بارگاہ میں دست بستہ کھڑے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے علوم کی کوئی انتہا نہیں، آپ کی کتابوں کو پڑھا جائے اور بالخصوص فتاویٰ رضویہ کو ہمارے مدارس میں پڑھا دیا جائے تو ایسے ایسے عالم نکلیں گے کہ ان کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کیونکہ خود فتاویٰ رضویہ کئی علوم کا خزینہ ہے۔

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کے کسی بھی فتویٰ پر کسی قسم کی تنقید حضرت سیدنا امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ سابق صوبائی وزیر مفتی غلام سرور قادری اپنی کتاب "الشاہ احمد رضا" صفحہ ۶۲ تا ۶۴، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء میں لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ملتان میں حضرت قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا اور اس دوران داڑھی کی حد شرع ایک مشت کے واجب ہونے سے متعلق اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کا ذکر آیا کہ جو شخص داڑھی ایک مشت سے کم کرواتا ہے وہ فاسق معلن ہے اور اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتوے پر فقیر نے انوار العلوم کے بعض اساتذہ کی تنقید کا ذکر کیا، سیدی وسندی قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی اُٹھ بیٹھے اور اعلیٰ حضرت کے اس فتوے پر تنقید کرنے والے صاحب پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اعلیٰ حضرت کے فتوے پر تنقید ہم سے برداشت نہیں ہوگی، یہ مدرسہ اعلیٰ حضرت کے نظریات حقہ کا علم بردار ہے۔ ہم کیا ہیں؟ اعلیٰ حضرت ہیں، سب کچھ انہیں کا صدقہ ہے ہم انہیں کے ریزہ خوار ہیں، ہم انہیں کے نام لیوا ہیں۔ جو شخص اعلیٰ حضرت کے نظریات وتحقیقات شریفہ سے متفق نہیں ہم اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمارے مدرسہ میں ایسے شخص کی کوئی گنجائش نہیں"۔

مزید فرمایا: ہم سب اہل سنت اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ ہی کی عظمت فکر کے مداح خواں ہیں اور

جو علماء اہل سنت میدان تحقیقات میں جولانیاں دکھاتے یا فضائے تدقیق میں پرواز کرتے ہیں۔ یہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ ہی کے فیوضات ہیں جس سے کوئی سنی عالم بے نیاز نہیں رہ سکتا"۔

مفتی غلام سرور قادری ہی ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں "ایک مرتبہ راقم مولانا نور احمد فریدی علیہ الرحمہ کے عرس کے موقع پر حضرت کے ساتھ جتوئی شہر (ضلع مظفر گڑھ) گیا، رات کو حضرت تقریر کرکے اپنی نشست گاہ پر تشریف لائے اور اپنی چارپائی پر لیٹے تو راقم آپ کے پاؤں دبانے بیٹھ گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ کوئی بات کریں۔ راقم نے عرض کی کہ مدرسہ انوار العلوم میں ایک صاحب نے اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ تو علم ظاہری کے ایک عالم تھے۔ بس یہ سنتے ہی حضرت اُٹھ کر بیٹھ گئے، پھر فرمایا کہ مولانا جس نے یہ بات کی ہے وہ اعلیٰ حضرت کے مقام سے بے خبر ہیں پھر فرمایا کہ مولانا اعلیٰ حضرت بریلوی اپنے زمانے کے مجدد برحق ہونے کے ساتھ ساتھ بے مثل عالم، بے مثل فقیہ، بے مثل محقق تھے پھر فرمایا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ اپنے زمانے کے غوث اور قطب عالم تھے۔ ان کی مثال اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ سے پہلے دور دور تک بھی نظر نہیں آتی، درحقیقت میرے سمیت اس دور کے تمام سنی علماء اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ ہی کے چشمہ علم وعرفان سے مستفید ومستفیض ہونے والے ہیں۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کے بعد اُن کے دو صاحبزادوں حجۃ الاسلام حامد رضا خان علیہ الرحمۃ، مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مصطفیٰ رضا خان علیہ الرحمہ جیسی ہستیاں بھی اپنی جگہ بے مثل ہیں اور ان کے پائے کی علمی وحقانی اور ربانی شخصیتیں نظر نہیں آتیں۔

ضلع وہاڑی کی تحصیل میلسی کے کچھ لوگوں نے جو امام احمد رضا کے مقام ومرتبہ سے واقف نہ تھے میلسی میں عرس اعلیٰ حضرت اور خلیفہ اعلیٰ حضرت علامہ سید ابو البرکات کے خطبہ جمعہ میں رکاوٹ ڈالنا چاہی تو حضرت مولانا احسن علی رضوی بہاولپور میں غزالی زماں کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر آپ کی قیام گاہ سے پتہ چلا کہ امام کاظمی عرس اعلیٰ حضرت میں شرکت کے لئے تیز گام سے کراچی جا رہے ہیں اور ابھی پانچ منٹ پہلے رکشہ سے اسٹیشن تشریف لے گئے ہیں مولانا احسن علی بھی دوسرے رکشہ سے ریلوے اسٹیشن پہنچے مگر اس وقت ریل گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہو چلی تھی، آپ چلتی گاڑی میں سوار ہوئے اور سمہ سٹہ ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر آپ کا ڈبہ تلاش کرنا شروع کیا۔ آپ سب سے پچھلے سیکنڈ کلاس ڈبہ میں تشریف فرما تھے مولانا احسن علی رضوی اس ڈبہ میں سوار ہوئے مگر عین اسی

وقت حضرت غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنا مصلّٰی جائے نماز لے کر نماز عصر ادا کرنے کیلئے نیچے اُترے اور نماز عصر ادا فرمائی۔ جب دعا سے فراغت پائی تو مولانا حسن علی رضوی نے عرض کیا کہ میلسی میں فلاں فلاں حضرت عید گاہ میلسی میں عرس اعلیٰ حضرت میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ مولانا حسن علی رضوی نے عرض کیا کہ آپ فلاں فلاں حضرات کے نام مکتوب تحریر فرما دیں تو قبلہ کاظمی نے جو مکتوب تحریر کیا اس میں سلام دعا کے بعد لکھا کہ آپ لوگ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجدد دین وملت قدس سرہ العزیز کے عرس مبارک میں ہرگز ہرگز کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں بلکہ تعاون کریں اگر سیدی حضرت علامہ سید ابوالبرکات خلیفہ اعلیٰ حضرت تشریف لائیں تو سبحان اللہ وہی جمعہ پڑھائیں۔

"مفتی اعظم ہند اوران کے خلفاء" صفحہ ۳۵ جلد اول مطبوعہ ممبئی ۱۹۹۰ء میں علامہ شہاب الدین رضوی نے خلیفہ مفتی اعظم ہند حضرت امام کاظمی کا ذکر خیر کرنے کے بعد آپ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے "حضور مفتی اعظم ہند تو مفتی اعظم عالم ہیں اس زمانے میں ان جیسا فقیہ و متقی میں نے دوسرا انہیں دیکھا، قرآن پاک میں خدا قدیر جل مجدہ خود ارشاد فرماتا ہے "**ان اولیائہ الا المتقون**" انہیں دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے، یہ خود ان کی ولایت کی دلیل ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ فقیر کاظمی کو سرکار مفتی اعظم ہند قبلہ سے خلافت و اجازت کا شرف حاصل ہے"۔

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کے خاندان کے ہر فرد کا آپ کے دل میں بہت احترام تھا۔

پروفیسر سید محمد جمیل الرحمٰن ماہنامہ عرفات مئی جون ۱۹۹۰ء صفحہ ۲۶ پر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "گذشتہ سالوں میں جب جماعت اہل سنت (جس کے آپ مرکزی صدر تھے) کے چند افراد نے آپ سے اختلاف کیا جس پر آپ نے بھی ان سے ناراضگی کا اظہار کیا، اتفاقاً حضرت مفتی اختر رضا خان بریلوی مدظلہ پاکستان تشریف لائے تو لاہور کے علماء نے ان کو صلح کے لئے ثالث مقرر کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ میں حضرت کاظمی صاحب کے پاس جاؤں گا تاکہ اختلاف ختم ہو سکیں۔ ادھر جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت مفتی اختر رضا خاں مدظلہ ثالثی کے لئے تشریف لا رہے ہیں تو امام کاظمی فرمانے لگے کہ اگر مجھے حضرت مفتی اختر رضا خان نے کہا تو میں اپنے مخالفین کے پاؤں پڑ جاؤں گا۔ آخر وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی اولاد جو ہیں۔

حضرت مولانا سردار احمد رضا فاضل جامعہ نظامیہ، لاہور بریلی شریف کے سجادہ نشین کے

ایک سفر کا حال اس طرح لکھتے ہیں کہ "واہگہ اٹاری بارڈر پر نہایت عظیم الشان استقبال ہوا جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں اعزازیہ دیا گیا حضور گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا کے آستانہ قدسیہ کی جامع مسجد میں اسپیکر بند کرا کے مکبر کھڑے کر کے نماز پڑھائی اور پھر خیبر میل کے ذریعے براستہ اوکاڑہ، ساہیوال، خانیوال و ملتان، سکھر، روہڑی، حیدر آباد کراچی تشریف لے گئے۔ جب خیبر میل بعد نماز مغرب ملتان شریف پہنچی تو حضور غزالی زماں ہزاروں علماء و احباب کے ہمراہ برائے استقبال اسٹیشن پر موجود تھے۔ اگرچہ زبردست اژدحام تھا مگر لوگ حضور غزالی زماں کے حسب ہدایت مثالی نظم و ضبط اور سلیقہ شعاری کے ساتھ صفیں باندھ کر پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے۔

عام طور پر کھڑکی پر مشتاقان دید مصافحہ و دست بوسی کرتے تھے عرض کیا گیا حضور علامہ کاظمی بھی تشریف لائے ہوئے ہیں تو حضرت سجادہ نشین قدس سرہ ٹرین کے گیٹ پر تشریف لائے اس دوران نظم و ضبط ختم ہو چکا تھا قبلہ کاظمی سیدنا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے خانوادہ کے صاحبزادہ گرامی کو ایسی عقیدت و محبت سے پیش آئے کہ حضرت نے والہانہ انداز میں مصافحہ و دست بوسی فرمائی اور پھولوں کا ہار پہنایا یہ حضور غزالی زماں کی سیدنا مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام اہل سنت قدس سرہ سے قلبی عقیدت و محبت تھی کہ ان کی چوتھی پشت کے صاحبزادے سے بھی ایسے آداب اور محبت و احترام سے پیش آ رہے تھے جیسے اعلیٰ حضرت کا دیدار فرما رہے ہیں۔

جس طرح امام کاظمی اعلیٰ حضرت اور ان کے خانوادے کا احترام کرتے تھے جواب میں خانوادہ اعلیٰ حضرت کے بزرگ بھی آپ کو اسی احترام اور اعتماد سے نوازتے تھے۔

روزنامہ "کوہستان" ملتان میں حضور غزالی زماں کا انٹرویو شائع ہوا جس کو اخباری رپورٹر نے کانٹ چھانٹ کر کے شائع کیا۔ جب انٹرویو شائع ہو چکا تو امام کاظمی کے مندرجہ ذیل الفاظ "دیوبندی خیال کے مسلمانوں" پر بعض احباب اہل سنت کو تردد ہوا تو انہوں نے یہ معاملہ فرزند اعلیٰ حضرت مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ فرزند اعلیٰ حضرت نے جو جواب عنایت فرمایا اس سے امام کاظمی پر آپ کے اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔ حضور مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی نے امام کاظمی کے الفاظ کی اس طرح تاویل فرمائی کہ "امام کاظمی کے لفظوں (دیوبندی خیال کے مسلمانوں) کا مفہوم یہ ہے کہ "دیوبندی صرف اپنے خیال میں مسلمان ہیں"۔

مجلہ "تعلیمات" ملتان اپنی ۱۹۹۰ء کی ایک اشاعت میں صفحہ ۴۴ پر لکھتا ہے۔ حضرت امام کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیر و مرشد حضرت علامہ سید محمد خلیل کاظمی محدث امروہوی علیہ الرحمۃ (م ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء) کے عرس مبارک منعقدہ ۶ شوال ۱۴۰۵ھ کے موقع پر اپنے اختتامی خطاب میں اپنے مریدین کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا "بنیادی وصیت یہ ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہو۔ تو میں آپ کو بتادوں کہ امام اہل سنت مجدد دین وملت الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی کا مسلک میرا مسلک ہے میرے تمام مریدین اسی مسلک پر قائم رہیں جو اعلیٰ حضرت کے مسلک سے ایک قدم بھی باہر رکھے گا وہ میرا مرید نہیں، ہاں وہ میرا مرید نہیں، ہاں وہ میرا مرید نہیں"۔

برصغیر کی پڑھی لکھی دنیا میں امام احمد رضا کو متعارف کرانے اور تحقیقات کی دنیا میں "رضویات" کا باب کھولنے والے حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ امام احمد سعید کاظمی سے اپنی عقیدت کا اظہار الہامی فضا میں لپٹے ہوئے ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"غزالی زماں رازی دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمی امروہوی چشتی صابری قادری بانی انوار العلوم ملتان اُن بزرگوں میں سے ہیں جو علم وفضل کے بحر ذخار اور دریائے معرفت کے شناور تھے۔ شہرت اُن پر ایسی عاشق وشیدا تھی کہ ہروقت اُن کے دروازے پر دربانی کے فرائض سرانجام دیتی تھی یہ بزرگ قیام پاکستان سے بہت پہلے پورے برصغیر پاک وہند میں اپنی فضیلت علمی اور شرافت نفسی کا لوہا منوا چکے تھے۔ امرتسر میں سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کا عرس مبارک نہایت تزک واحتشام سے منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس مقدس وبابرکت محفل میں سربرآوردہ مشائخ اور جید علمائے کرام شرکت کرنا اپنے لئے باعث فخر ومباہات جانتے تھے۔

چنانچہ مذکورۃ الصدر بزرگ بھی اس سہ روزہ محفل (اجلاس) میں شرکت فرماتے اور اہالیان امرتسر کو اپنے مواعظ حسنہ دعلیہ سے بہرہ ور فرماتے۔ لہٰذا احقر اُس زمانے سے ان بزرگ کے مداحین میں شامل تھا پاکستان میں ہجرت کے بعد ان بزرگ کو بہت قریب سے دیکھنے کا بھی موقع میسر آیا اور یہ بزرگ فقیر حقیر پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ 1973ء میں جب راقم السطور کو مدینہ منورہ میں حاضری کی سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی تو وہاں قطب مدینہ شیخ العرب والعجم حضرت شاہ ضیاء الدین احمد قادری مہاجر مدنی خلیفہ خاص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری

بریلوی (قدس سرہ) کے آستانہ عالیہ پر ہر روز حاضری سے مشرف ہوتا رہا اور متعدد مرتبہ حضرت قطب مدینہ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا "اس وقت پاکستان میں صرف دو ہی معتبر اور قابل اعتماد عالم دین ہیں ایک حضرت ابوالبرکات سید صاحب اور دوسرے علامہ سیّد احمد سعید کاظمی صاحب" حضرت قطب مدینہ کی لسان فیض ترجمان سے ان بزرگوں کی عظمت کے اعلان سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ ان کے بارے میں میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ 25 رمضان المبارک 1406ھ کو حضرت غزالی دوراں مکین خلد بریں ہو گئے تو عوام اہل سنت بالکل بے سہارا ہو گئے۔ حضرت قبلہ کاظمی شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کی ذات گرامی فی الحقیقت مستغنی عن الخطاب ہے جب انکا نام نامی آجائے تو خطاب والقابات اُن کی قد آور شخصیت سے بہت چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ وہ نابغہ روزگار علماء میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

سالہا باید تا یک فرد حق پیدا شود

بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

تحریک پاکستان کے مبلغ اعظم حضرت ابوالمحامد سید محمد محدث کچھوچھوی اشرفی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ آل انڈیا سنی کانفرنس منعقدہ بنارس 1946ء کے آخر میں درج ہدایات وتجاویز کی روشنی میں اگر پاکستان کے اندر متفقہ طور پر مرکزی دارالافتاء قائم کیا ہوتا یا کم از کم اہل سنت کو در پیش نت نئے مسائل کے حل کے لئے امارت شرعیہ قائم کی ہوئی تو یقیناً کاظمی شاہ صاحب اُس کے متفقہ طور پر صدر الصدور قرار پاتے اور چھوٹے چھوٹے مولوی اور خود ساختہ مفتی جو عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں انہیں اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر جھانکنے کی بھی جرأت نہ ہوتی۔ مگر وائے افسوس کہ یہاں اُلٹی گنگا بہنے لگی۔ حضرت قطب مدینہ قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق قبلہ کاظمی شاہ صاحب آخری اہل حق سربرآوردہ عالم دین ثابت ہوئے"۔ (مقدمہ گستاخ رسول کی سزا۔ ص ۳)

حکیم اہل سنت کی اس تحریر سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ حضرت سیدنا امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی اور فکر رضا کے کتنے عظیم پرچارک تھے۔

صاحبزادہ افتخار الحسن رحمۃ اللہ علیہ

صاحبزادہ افتخار الحسن 1923ء میں سیالکوٹ کے گاؤں البڑ میں پیدا ہوئے یہ وہی "البڑ" ہے جس کی لوری پنجاب کے بچے بڑے شوق سے گاتے ہیں "البڑ بلبڑ باوے گا باوا کنک لیاوے گا باوی بہہ کے چھٹے گی سورو پیہ دلے گی"۔

آپ والد ماجد حضرت مولانا محمد مسعود اپنے وقت کے بڑے زبردست مناظر تھے اور فاتح مرزائیت وعیسائیت کے القاب سے جانے جاتے تھے اور طریقت میں حضرت شاہ لاثانی پیر سیّد جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید وخلیفہ تھے۔

صاحبزادہ افتخار الحسن لڑکپن میں کبڈی کے بڑے نامور کھلاڑی تھے آپ خود لکھتے ہیں۔ "مخالف نوجوان کے سر سے چھلانگ لگا کر نکل آنا میرا خاص فن تھا۔ میرا ریکارڈ تھا کہ سات سال کے عرصے میں نہ مجھے کسی نے پکڑا تھا اور نہ ہی کوئی مجھ سے نکل کر گیا تھا۔ تحصیل پسرور کے سالانہ ٹورنمنٹ میں میں نے 24 فٹ 3 انچ لمبی چھلانگ لگائی۔ کیا پتہ تھا کہ یہی کھیل اولمپک بن کر بین الاقوامی حیثیت اختیار کر جائیں گے ورنہ آج دوڑ اور چھلانگ میں پاکستان کا ریکارڈ ہوتا اور سینکڑوں طلائی تمغے میرے پاس ہوتے"۔

آپ دن بدن کھیل کے میدان میں شہرت پذیر ہو رہے تھے اور آپ کے والد آپ کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ ایک دن جب حسب معمول مولانا سید محمد مسعود اپنے شیخ طریقت کے آستانہ عالیہ پر حاضری کو جانے لگے تو نوعمر افتخار الحسن کو بھی ساتھ لے لیا اور یہی دن آپ کی تقدیر بدلنے کا دن تھا۔

آستانہ عالیہ کا روحانی ماحول، حضرت شاہ لاثانی کی صحبت کا اثر، تہجد کا وقت اور مقبولیت کی گھڑی، مولانا محمد مسعود رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ طریقت سے عرض پرداز ہوئے کہ حضور افتخار کو بھی اپنی غلامی میں داخل کر لیجئے۔ حضرت نے داخل سلسلہ کیا اور توجہ فرمائی جو سلسلہ نقشبندیہ کا خاصہ ہے۔ بس پھر کیا تھا نوجوان کھلاڑی راہ طریقت کا سالک بن گیا اور مرشد کی زلف گرہ گیر کا ایسا اسیر ہوا کہ حالات کے طوفان اور مصائب کے پہاڑ اسے اپنے راستے سے نہ ہٹا سکے۔ ذات بے نیاز کی حکمتیں بھی کتنی عجیب ہیں ادھر مرشد کامل کا دامن نصیب ہوا اور ادھر شفقت پدری کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

والد صاحب کے وصال کے بعد آپ کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہوئی تو آپ نے علم دین حاصل کرنے کے لئے سفر شروع کیا ابتدا آپ نے شاہ کوٹ کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے میر پور میں حضرت مولانا سید احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کی اور سال بھر انتہائی .... کے ماحول میں مجاہدہ وریاضت کے ساتھ ابتدائی کتابیں صرف بہائی اور نحو وغیرہ پڑھیں۔

بعدازاں اندرون دہلی دروازہ لاہور میں مفتی اعظم پاکستان ابوالبرکات سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں کچھ عرصہ پڑھا حزب الاحناف میں پڑھائی کے دوران ہی آغا بیدار بخت کے ٹائمٹ کالج سے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ پھر کچھ کتابیں جامعہ نعمانیہ میں پڑھیں۔ پھر جامعہ فتحیہ اچھرہ میں ملاحسن، ملاجلال، میر زاہد، صدرہ، مقامات حریری، مشکوٰۃ شریف اور تفسیر جلالین، شیخ الحدیث مولانا غلام رسول رضوی اور حضرت مولانا مہر محمد رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھیں اور دورہ حدیث صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی سے جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں پڑھا۔ مراد آباد کے قیام کے دوران شاعری سے بھی شغف فرماتے رہے اور طرحی اور غیر طرحی مشاعروں میں کلام پڑھتے رہے بعد حالات نے مشق سخن جاری نہ رہنے دی لیکن اس دور میں جگر مراد آبادی تک سے داد پائی۔ دورہ حدیث کی تکمیل پر مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی نے دستار فضیلت

باندھی اور سند عطا فرمائی اس موقع پر محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ جب آپ دورہ حدیث کر کے فارغ ہوئے تو تحریک پاکستان اپنے آخری اور فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی آپ نے تحریک میں بڑے جوش و جذبے سے حصہ لیا اور مسلم لیگ میں مختلف عہدوں پر رہ کر کام کیا اور ساتھ ہی جلسوں میں خطابت کے جوہر بھی دکھائے۔

قیام پاکستان کے بعد جس طرح مسلم لیگ محلاتی سازشوں کا شکار ہوئی وہ ہماری تاریخ کا شرمناک باب ہے لہلہاتے وزارت کے مجنونوں نے جس طرح اسلام اور دو قومی نظریہ سے غداری کی اس نے اہل حق کو مسلم لیگ سے دامن بچانے پر مجبور کر دیا۔ دیگر علمائے اہل سنت کی طرح آپ بھی حکومتی ٹولے کے سامنے کلمہ حق کہنے کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ وہی صاحبزادہ افتخار الحسن جو چند سال پہلے پاکستان کے حق میں دھواں دار تقریریں کر کے لوگوں سے مسلم لیگ کے ووٹ مانگا کرتے تھے اب مسلم اور اس کے کرتا دھرتا سیاستدانوں کے خلاف کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ اس دور کی ایک یادگار تقریر سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس سے صاحبزادہ افتخار الحسن کے اندر کے درد و کرب کا پتہ ملتا ہے۔

☆ ''اسلام کے نام پر پاکستان حاصل کر کے اسلام سے غداری کرنے والو۔ اب اسلام تمہارے دروازے پر دستک دے رہا ہے کہ میری عظمت کے پرچم بلند کرو۔

☆ دین تمہارے دامن پکڑ کر فریاد کر رہا ہے کہ میری سربلندی کا نعرہ لگا کر وزارت کی کرسیوں پر بیٹھنے والو میری آبرو کی چادر چھننے سے بچاؤ۔

☆ قرآن پاک تمہاری کوٹھیوں کے ریشمی پردوں سے لپٹ کر رو رہا ہے کہ میرا نظام نافذ کرنے کا وعدہ کر کے اقتدار کی گدیوں پر بیٹھنے والو میرے نظام کو نافذ کر کے میری عزت کا سورج طلوع کرو۔

☆ کیا دس لاکھ مسلمان اس لئے شہید ہوئے تھے کہ تم اُن کے خون سے اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رنگ و روغن کر سکو۔

☆ کیا پچاس ہزار مسلمان عورتوں کی عصمت و آبرو کے فانوس اس لئے بجھے تھے کہ تم آتش بازی کے نظاروں سے لطف اندوز ہو سکو۔

☆ کیا ہماری لاکھوں بہنوں اور بیٹیوں کے سہاگ اس لئے اجڑے تھے کہ تم عزت گاہوں میں شراب کے دور چلا سکو۔

☆ کیا مسلمانوں نے تمہیں اس لئے ووٹ دیئے تھے کہ تم ثقافت کے نام پر عیاشی، فحاشی اور عریانی پھیلا سکو۔

☆ کیا ہزاروں معصوم بچے اس لئے نیزوں پر چڑھے تھے کہ تم کلبوں میں رقص و سرود کی محفلیں سجا سکو''۔

یہ تقریر طارق آباد فیصل آباد کی جامع مسجد میں ہوئی جہاں آپ جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور یہ دور تھا 1949ء کا۔

اس تقریر نے ایک طرف تو عوام میں بے پناہ جوش و خروش پیدا کر دیا اور دوسری طرف حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا۔ حکومتی اہلکار اور قانون دونوں حرکت میں آئے اور ایک معینہ مدت کے لئے جبراً اور قانوناً آپ کی زبان بندی کر دی گئی۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

یہ حکومت اور صاحبزادہ افتخار الحسن کا پہلا ٹکراؤ تھا اور پھر یہ سلسلہ ''جرم و سزا'' ساری زندگی چلتا رہا نہ کبھی صاحبزادہ افتخار الحسن نے اپنے موقف اور لہجہ میں تبدیلی کی اور نہ کبھی انگریز کے کالے قانون نے انہیں معافی دی۔

1953ء میں جب نظریہ ختم نبوت کے دفاع میں تحریک چلی اُس میں بھی آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

ایک موقع پر میانوالی جیل (جسے پاکستان کا کالا پانی کہا جاتا ہے) میں پابند سلاسل کچھ

نوآموز اور نوجوان علماء، دینی کارکن اور مدارس کے معصوم طلباء حکومت کے وحشیانہ تشدد سے دلبرداشتہ ہو کر ہمت ہار بیٹھے تو صاحبزادہ افتخار الحسن ہی تھے جنہوں نے ان ناتجربہ کاروں کو سنبھالا دیا اور ان کی تربیت کی اور انہیں حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے واقعات قید و بند سنا سنا کر نیا حوصلہ اور ولولہ بخشا اور جیل میں اُن کا غم غلط کرنے کے لئے نعت خوانی اور قوالی وغیرہ کا اہتمام کر کے آسانیاں پیدا کیں۔ تحریک تحفظ ختم نبوت میں آپ نے ایک سال میانوالی جیل میں اور 2 ماہ لاہور............ کاٹے جو اس دور کے بدترین قید خانے تھے۔

لاہور میں شاہی قلعہ کی قید کے دوران آپ کو آپ کے مرشد گرامی حضرت پیر سید علی حسین شاہ نقش لاثانی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی اور آپ نے خواب میں آکر رہائی کی خوشخبری سنائی۔

80 کی دہائی کے آخر میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے خطابت کی مصروفیات اور سیاست و قیادت کی سرگرمی بھی ماند پڑ چکی تھی 1989ء میں ملعون سلمان رشدی نے آقا کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی تو آپ کی غیرت ایمانی اور جوش عشق کے باعث جوانی کی توانائی عود کر آئی آپ نے بستر مرگ سے گستاخ سلمان رشدی کو للکارتے ہوئے کتاب ''گستاخ رسول کی سزا'' لکھی جو آپ کے عشق رسول کی منہ بولتی تصویر بھی ہے اور آپ کی زندگی کا آخری معرکہ بھی۔

آپ کی وفات حسرت آیات پر صاحبزادہ طارق محمود (دیوبندی) نے اپنے زیر ادارت نکلنے والے ماہنامہ ''لولاک'' میں آپ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''صاحبزادہ سید افتخار الحسن شاہ ایک عظیم عوامی خطیب تھے۔ بریلوی مکتب فکر میں صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ کے بعد بلاشبہ وہ بڑے خطیب تھے۔ مرحوم سالہا سال سے ختم نبوت کانفرنس چنیوٹ اور پھر ربوہ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مرحوم آخری مقرر کی حیثیت سے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتے اور پھر اس طرح چھا جاتے کہ ان کی خطابت کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا۔ شاہ صاحب شوگر کے عارضہ کے باعث چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھے۔ انہیں معذوری کی یہ

تکلیف گذشتہ دو برس سے تھی لیکن اس کے باوجود آپ ربوہ ختم نبوت کانفرنس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے ایک خادم اور رفیق نے بتایا کہ ایک دفعہ سفر سے واپس آرہے تھے کہ راستہ میں آپ نے فرمایا میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ زبان سے معذور نہ فرمائے تاکہ میں اس کی حمد و ثناء اور اس کے حبیب ﷺ کی تعریف و توصیف بیان کرتا رہوں۔

صاحبزادہ سید افتخار الحسن شاہ بلاشبہ بڑے عوامی خطیب تھے۔ لیکن آپ کی خطابت، شجاعت سے عبارت تھی۔ دور ایوبی میں ملک امیر محمد خان مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک آمر اور جابر گورنر کے بارے میں کہا ''گورنر کی مونچھوں سے بغاوت ہو سکتی ہے۔ محمد ﷺ کی زلفوں سے بغاوت نہیں ہو سکتی''۔ صرف اتنی بات پر شاہ صاحب کو شاہی قلعہ دیکھنا پڑا تھا۔ آپ نے ہر دور میں کلمہ الحق بلند کیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں......

1953ء کی تحریک ختم نبوت میں مرحوم نے بڑی جگرداری اور بہادری سے حصہ لیا۔ فیصل آباد سے رضا کاروں کا جو قافلہ روانہ ہوا تھا، شاہ صاحب نے اس کی قیادت فرمائی۔ روانگی سے پہلے شاہ صاحب کو ایک بڑے جلوس کی صورت میں ریلوے اسٹیشن تک لایا گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر صاحبزادہ صاحب نے تانگے پر کھڑے ہو کر ایک ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔

صاحبزادہ سید افتخار الحسن شاہ نے اپنی تصنیف ''زندگی'' میں لکھا ہے کہ میری شفاعت اور بخشش کے لئے 1953ء کی تحریک میں اسٹیشن والی تقریر ہی کافی ہے۔ منیر انکوائری رپورٹ میں صاحبزادہ سید افتخار الحسن شاہ کی اس تقریر کا ذکر موجود ہے جس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ اس تقریر نے پورے شہر میں آگ لگا دی تھی۔ آپ نے مختلف جیلوں میں ساڑھے تین سال قید کاٹی۔ اگرچہ مرحوم بڑے خوش پوش، خوش خوراک اور نفیس الطبع انسان تھے لیکن اس کے باوجود نہایت پامردی اور جوانمردی سے اس طرح جیل کاٹی کہ مرحوم کے پائے ثبات میں لغزش تک نہ آئی۔

آخری ایام میں شاہ صاحب مرحوم کا جسم مختلف عوارض کا ہسپتال بن گیا تھا۔ شوگر کے عارضہ کے باعث مرحوم چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن آپ نے اپنے حلقہ احباب سے رابطہ

رکھا۔ جلسوں، کانفرنسوں اور عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے رہے۔ تقریر کے آغاز میں کہا کرتے تھے "میں کونجوں کی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج ہوں۔ جب کونج ڈار سے بچھڑ جائے تو روتی نہیں بلکہ کرلاتی ہے۔ رونا اور ہے، کرلانا اور ہے"۔

صاحبزادہ سیّد افتخارالحسن شاہ ایک تاریخ ساز، عہد آفرین شخصیت تھے۔ مرحوم بے پناہ خوبیوں اور کمالات کے مالک تھے۔ راقم کو انہیں بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کو پڑھنے کا موقع ملا۔

15 جولائی بروز جمعرات بعد نماز عصر صاحبزادہ سیّد افتخارالحسن شاہ کا جنازہ اٹھایا گیا تو ہر آنکھ اشکبار تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے معتقدین زار و قطار رو رہے تھے۔ جنازہ مسلم ہائی سکول طارق آباد کی گراؤنڈ میں پہنچا تو انسانوں کا جم غفیر موجود تھا۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے علمائے کرام اور شاہ صاحب کے مریدین نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ شیخ الحدیث مولانا غلام رسول رضوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بعدازاں صاحبزادہ سید افتخارالحسن کو جامع مسجد الفردوس منصور آباد میں جہاں مرحوم نے سالہا سال خطابت کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ اپنی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔ شاہ صاحب کی تدفین کے وقت رقت آمیز مناظر دیکھے گئے۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

علامہ ارشد القادری اسلاف کا عکس جمیل

اس کائنات رنگ و بو میں آنے والا ہر شخص کسی نہ کسی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے کوئی عالم دین ہے تو علم کا نور بانٹ کر اپنی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے کوئی ادیب ہے تو زبان و ادب کی خدمت کرکے اہل زبان سے داد حاصل کرتا ہے کوئی شاعر ہے تو الفاظ کو کسی خوبصورت بحر میں سجا کر اہل ذوق سے واہ واہ سنتا ہے اور کوئی مصلح ہے تو معاشرے کی اصلاح کرکے افراد معاشرہ میں عزت کا مقام پاتا ہے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

لیکن اس وقت ہمارا قلم جس عظیم ہستی کے در پہ جبیں سائی کر رہا ہے وہ قدرت کا ایسا "گل رنگیں ادا" تھا کہ نقاش ازل نے اس کے پیرہن میں کئی رنگ بھرے تھے اور کئی خوشبوئیں بسائیں تھیں میری مراد ہیں برصغیر کے صف اوّل کے قلمکار، عالمی شہرت یافتہ سکالر، ممتاز عالم دین، بے باک صحافی، مایہ ناز شاعر و ادیب اور عظیم مصلح قوم حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

آپ بھارت کے صوبہ اتر پردیش میں 1925ء کو پیدا ہوئے فقیر و درویشی اور طبع سلیم شفقت پدری کے سائے میں حاصل کی۔ علوم و معارف کی لازوال دولت ہندوستان کے نامور بزرگ اور عالم دین حافظ ملت حضرت حافظ عبدالعزیز محدث مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے ماموں، کراچی کے مشہور شیخ الحدیث حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری رحمۃ اللہ علیہ سے پائی۔ سلوک کی منزلیں اپنے بہنوئی، اعلیٰ کے خلیفہ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر تہہ کیں اور خرقہ خلافت شہزادہ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند الشاہ مصطفیٰ رضا خان نوری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔ حضور رحمۃ للعالمین ﷺ کے تصدق ان کی روح پر رحمت خداوندی کی ایسی برکھا برسی کہ ان کا وجود "اسلاف کا عکس جمیل" بن گیا۔

1946ء میں آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز مدرسہ اسلامیہ ناگ پور میں علوم اسلامیہ کی تدریس سے کیا جہاں دیگر مشاہیر کے علاوہ برصغیر کے مشہور مصنف فقیہ ملت علامہ جلال الدین امجدی علیہ الرحمۃ بھی آپ کے خوشہ چینوں میں شامل رہے۔

1956ء میں استاذ محترم نے دین کی تبلیغ اور عوام کے عقائد واعمال کی اصلاح کی خاطر آپ کو صوبہ بہار کے شہر جمشید پور جانے کا حکم صادر فرمایا۔ آپ نے جمشید پور پہنچ کر بے سروسامانی کے عالم میں علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کا کام شروع کیا۔ کھلے آسمان تلے ایک گزرگاہ کے کنارے مسند تدریس بچھائی اور مسلسل پانچ سال تک قال قال رسول اللہ ﷺ کی صدائے دلنواز بلند کر کے اصحاب صفہ کی سنت کو زندہ کرتے رہے۔

آپ کی بے لوث، بے ریا اور پرخلوص خدمت نے جمشید پور کے مسلمانوں کو آپ کا گرویدہ کر دیا آپ کی محبت لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی۔ بچے، بوڑھے، جوان سبھی آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آپ کی خدمات کے معترف تھے۔

پھر وہ دن بھی آئے کہ آپ نے جمشید پور میں زمین خریدی اور باقاعدہ ''جامعہ فیض العلوم'' قائم کیا جس میں علوم اسلامیہ کے علاوہ صنعت وحرفت کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جہاں دور دراز سے طلبہ آتے اور علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ مختلف ہنر بھی سیکھتے۔ آپ کے ان اقدامات کے باعث جمشید پور میں آپ کو اس قدر پذیرائی ملی کہ آپ وہیں کے ہو رہے آبائی علاقے کی بجائے جمشید پور آپ کی پہچان بن گیا ایک وقت تھا کہ آپ جمشید پور کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آیا کہ پوری دنیا کے علمی حلقوں میں جمشید پور آپ کی نسبت سے پہچانا جانے لگا۔ آپ کے دینی کارناموں سے ایک طرف تو عام خوش عقیدہ مسلمان خوشی کا اظہار کرتے تھے اور دوسری طرف غیر ملکی امداد پر پلنے والے فرقہ پرست عناصر آپ کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت سے خائف رہتے اور کسی نہ کسی طرح آپ کو نیچا دکھانے کے درپے رہتے۔

1954ء میں مدرسہ مفتاح العلوم ضلع مؤ کا شیخ الحدیث عبداللطیف نعمانی جو اپنے فرقے میں بہت بڑا مناظر مانا جاتا تھا آپ سے مناظرہ پر آمادہ ہوا۔ تائید ایزدی علامہ

ارشد القادری کے ساتھ تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ آپ حق اور اہل حق کے نمائندے تھے۔ مناظرہ ہوا اور خوب ہوا۔ نعمانی بے چارہ آپ کے دلائل قاہرہ اور حاضر جوابی کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ اسے منہ کی کھانی پڑی اور آپ کو اس کامیابی پر ''فاتح جمشید پور'' کا خطاب ملا۔

پھر آپ نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ جمشید پور سے ماہنامہ ''جام نور'' اور مغربی بنگال کے شہر کلکتہ سے ماہنامہ ''جام کوثر'' کا اجراء کیا دونوں پرچوں کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جس میں آپ کے پاکیزہ جذبات واحساسات، سلجھی ہوئی فکر اور کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی زبان کو بڑا دخل تھا۔ آپ کے اداریے اتنے شائستہ اور شستہ ہوتے کہ عقل سلیم کو سوائے تسلیم کے کوئی چارہ نہ رہتا۔

مختلف موضوعات پر آپ کے مضامین اتنے شاندار اور جاندار ہوتے کہ پڑھا لکھا طبقہ آپ کی خوبی تحریر کا اسیر ہو جاتا۔ آپ کی مہذب اور بے مثال تحریریں اپنا رنگ جمانے لگیں اور مشرقی ہند سے نکل کر پورے ہندوستان، پھر برصغیر اور پھر پوری دنیا میں مقبول ہوئیں۔ جس طرح تدریس کے شعبہ میں آپ نے نام کمایا اور مناظرے کے میدان میں کامیابی حاصل کی اسی طرح صحافت اور تصنیف وتالیف میں بھی اپنا لوہا منوایا۔

آپ نے ''زلزلہ'' لکھی تو مکتب دیوبند کے ایوانوں میں واقعی زلزلہ برپا ہو گیا۔ یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے کہ ''زلزلہ'' کے جواب میں چھوٹی بڑی ایک سو بیس کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ ارشد القادری کا قلم ایک بار پھر حرکت میں آیا انہوں نے ایک سو بیس کتابوں کو سامنے رکھ کر انکا جواب ''زیروزبر'' کے نام سے لکھا جو اسم بامسمیٰ ثابت ہوا۔ دنیا نے دیکھا کہ وہ ایک سو بیس کتابیں ''زیروزبر'' ہو گئیں انکا نام ونشان مٹ گیا مارکیٹ میں کہیں دور تک دکھائی نہیں پڑتیں اور الحمدللہ ''زلزلہ'' پہلے سے بڑھ کر مارکیٹنگ کر رہی ہے۔

پھر آپ نے ایک اور کتاب ''تبلیغی جماعت'' لکھی پھر جماعت اسلامی، مقام مصطفیٰ، زلف وزنجیر اور درجنوں کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں دیار ہند سے نکل کر بلاد عرب میں پہنچیں وہاں سے ادیب شہیر حضرت مولانا محمد منشا تابش قصوری مدظلہ پاکستان لائے اور حضرت پیرزادہ

اقبال احمد فاروقی دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے جمالیاتی ذوق کے پیش نظر بڑے خوبصورت انداز میں شائع کیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے پاکستان میں ایسی مقبول ہوئیں کہ پچھلے ۳عشروں میں درجنوں ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر پبلشر خوب سے خوب تر انداز میں چھاپ کر خوش ہوتا ہے۔

1972ء میں جب ورلڈ اسلامک مشن قائم ہوا تو قائد اہلسنت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمۃ کو صدر اور آپ کو ناظم اعلیٰ چنا گیا۔آپ نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قائد اہل سنت کے شانہ بشانہ کام کیا پوری دنیا کے دورے کئے مختلف ملکوں میں دینی ادارے قائم کئے اور مختلف زبانوں میں اہل سنت کا لٹریچر شائع کیا اور یورپ کے قلب لندن میں اپنا مرکز قائم کیا جو بعد میں آنے والے علماء کے لئے ایک سائبان ثابت ہوا۔آپ کی شہرت ہندوستان کی جغرافیائی حدود وقیود سے نکل کر پورے عالم اسلام میں پھیل گئی اور پوری مسلم اُمہ آپ کو اپنا قیمتی سرمایہ تصور کرنے لگی۔

لیکن اس کے باوجود آپ کو ہندوستان کے غریب مسلمانوں کا ہمیشہ قلق رہا اور آخری سانس تک اُن کے حقوق کے لئے اخلاقی صحافتی اور سیاسی سطح پر کوشاں رہے اور مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہندوستان میں کئی ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کیں اس کے علاوہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے آپ ہر دور حکومت میں اہل اقتدار کو پوری توانائی اور جرأت کے ساتھ قائل کرتے رہے اور پارلیمانی سیاست میں باقاعدہ حصہ لئے بغیر حکومت ہند کے مرکزی اور مقامی وزیروں سے ملاقات کر کے اپنی علمی قابلیت شخصی وجاہت اور اچھی شہرت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے بے شمار مسائل حل کرائے۔

تعلیمی میدان میں آپ کا کام پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔دارالعلوم ضیاء الاسلام کلکتہ، ادارۂ شرعیہ پٹنہ، فیض العلوم گرلز اینڈ بوائز ہائی سکول جمشید پور، مدرسہ دارلسلام جمشید پور، مدرسہ تنویر الاسلام اور اسلامی مرکز رانچی، مدرسہ غوثیہ کوڈرما، تربیت گاہ برائے آئمہ مساجد و کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر جامعہ غوثیہ رضویہ سہارنپور۔دارالسلام رضویہ کلیر شریف۔دارالعلوم اہل

سنت جے پور کے علاوہ مغربی بنگال، راجستھان اور مہاراشٹر میں کئی مساجد تعمیر کروائیں۔آخری عمر میں تبلیغی جماعت کے بین الاقوامی مرکز دہلی کی بستی نظام الدین میں ایک شاندار چار منزلہ عمارت میں قدیم و جدید علوم کا تعلیمی ادارہ قائم کیا اور آخری سانس تک اسے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے میں لگے رہے۔

علامہ ارشد القادری کی بے شمار نیکیوں میں ایک عظیم نیکی دعوت اسلامی کا قیام ہے اس سلسلے میں امیر دعوت اسلامی مولانا محمد الیاس قادری اپنے کتابچہ "دعوت اسلامی کا بانی کون" میں لکھتے ہیں۔

جب علامہ ارشد القادری نے مجھے امارت سونپنی چاہی تو میں نے عرض کیا میں اس قابل نہیں تو علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے ازراہ تفنن فرمایا" مجھے زیادہ قابل آدمی کی ضرورت بھی نہیں"

آپ دعوت اسلامی کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اس کا اندازہ ماہنامہ امیر اہلسنت لاہور جنوری 2006ء میں شائع ہونے والے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو علامہ ارشد القادری نے جمشید پور میں دعوت اسلامی کے بانی حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی کو دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے پر مبارکباد کے انداز میں لکھا۔آپ لکھتے ہیں۔

"حضرت مولانا المکرم عبدالمبین نعمانی صاحب زید مکارمکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔مزاج گرامی 9 دسمبر کو میں جمشید پور حاضر ہوا یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ حضرات نے یہاں دعوت اسلامی کی شاخ قائم کر دی ہے یہاں کے سنی مسلمانوں پہ آپ حضرات کا یہ احسان ہے۔کل شام کو دعوت اسلامی جمشید پور کے مبلغین میرے پاس آئے۔انہیں دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوئی ہمارے یہاں کی مسجد میں جماعت کے اندر کئی نمازیوں کا اضافہ ہوگیا۔

آپ لوگوں نے مشاہدہ کر لیا ہوگا کہ مشاہیر علماء بالخصوص علماء مبارکپور کسی تحریک کی عملاً حمایت کر دیں تو اس میں بڑی جان پڑ جاتی ہے۔مولا نے قدیر ہمارے علمائے کرام کو برائے سُنت واشاعت دین نقل و حرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

دوبارہ میں آپ حضرات کے اقدام کی تحسین کرتے ہوئے آپ حضرات کو ہدیہ تبریک

پیش کرتا ہوں۔

فقط والسلام آپ کا مخلص دعا گو

ارشد القادری، جمشید پور

علامہ ارشد القادری آخری عمر میں "حیات النبی ﷺ" کے عنوان سے سیرت طیبہ پر ایک ضخیم کتاب شروع کر چکے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی اس کے علاوہ مولانا وحید الدین خاں کے خطرناک افکار و نظریات کے رد میں بھی ایک کتاب زیر قلم تھی وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ حضرت علامہ ارشد القادری نے اپریل 2002ء میں بھارت کی راجدھانی دہلی میں وصال فرمایا اور جمشید پور آپ کا مزار پر انوار آج بھی زبان حال سے گویا ہے۔

نشان منزل مقصود ہے میری تربت
نشاں یہ چھوڑتا ہوں اہل کارواں کے لئے

فقیہ ملت مفتی جلال الدین امجدی رحمۃ اللہ علیہ

مراد سنگھ راجپوت فیملی کا فرد تھا لیکن تھا بڑا سلیم الفطرت۔ دین اسلام سے اسے دلچسپی تھی، وہ دل سے اسلام کی خوبیوں کا معترف تھا مگر کفر کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا، خاندان اور برادری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن جیسے جیسے مراد سنگھ کے دل میں اسلام دوستی کے پاکیزہ جذبات پروان چڑھتے رہے ویسے ویسے ہی اس کے اندر ظالم سماج سے ٹکرانے کی جرات بھی پیدا ہوتی گئی اور آخر ایک دن وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے فطری انقلاب کو علی الاعلان ظاہر کر کے اسلام کے دامن میں آ گیا اور "مراد سنگھ" سے "مراد علی" بن کر اسلامی برادری کا ایک معزز رکن بن گیا۔ مراد علی کے اس جرات مندانہ اقدام نے خاندان اور سماج میں کھلبلی مچا دی۔ راجپوت اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ خاندان والوں کی مخالفت کی وجہ سے مراد علی کو اسلام اور خاندان دونوں میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑا۔ اس نے خاندان کی محبتوں کو اسلام کی صداقتوں پر قربان کر دیا اور ہجرت کی سنت ادا کرتے ہوئے اپنے وطن مالوف (بڑہر) کو چھوڑ کر ضلع فیض آباد کے ہی قصبہ شہزاد پور میں سکونت کر لی۔ مراد نہ صرف خود مراد کو پہنچا بلکہ اپنی اولاد کو بھی "منزل مراد" کا پتہ دے گیا۔ مراد علی کی چوتھی پشت میں سے ضیاء الدین مرحوم شہزاد پور سے اتر پردیش کے ضلع بستی کے ایک قصبہ "اوجھا گنج" منتقل ہو گئے۔ انہیں ضیاء الدین مرحوم کی چوتھی پشت میں ہمارے ممدوح مکرم فقیہ ملت حضرت مفتی جلال الدین احمد امجدی نے ۱۹۳۳ء میں جنم لیا۔ حضرت فقیہ ملت کے والد ماجد (جان محمد مرحوم متوفی ۱۹۵۱ء) بغیر کسی مقررہ مشاہرے کے جامع مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض سر انجام دیا کرتے۔ بچوں کو پڑھاتے اور ابتدائی تعلیم و تربیت فرماتے تھے) اپنے تقویٰ و پرہیز گاری کے باعث پورے اوجھا گنج میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت فقیہ ملت نے تقریباً ۱۰ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی اور تقسیم ہند سے قبل ہی فارسی کی تکمیل بھی کر لی تھی پھر ۱۹۴۷ء میں آپ عالم اسلام کے عظیم عالمی مبلغ حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ ناگن پور میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ علامہ ارشد القادری اپنے ہزاروں شاگردوں میں حضرت فقیہ ملت پر بجا طور پر فخر فرماتے۔ آپ اوجھا گنج میں پہلے باقاعدہ اور مستند عالم دین شمار ہوتے تھے اور آج اوجھا گنج میں جتنے بھی علماء کرام ہیں یا تو آپ کے شاگرد ہیں یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔

جب آپ عالم دین ہو کر اپنے علاقے اوجھا گنج میں پلٹے تو آپ نے غلط رسومات کے خلاف بڑی تندہی سے عملی میدان میں کام کیا۔ اوجھا گنج میں یہ عام رواج تھا کہ قربانی کے بکروں کا گوشت مسلمانوں کیساتھ ساتھ ہندوؤں میں بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ آپ نے لوگوں کو مسئلہ سمجھایا کہ قربانی کے علاوہ تالیف قلب کیلئے کوئی تحفہ وغیرہ دیا جائے تو وہ دوسری بات ہے بلکہ اسلام کی اخلاقی تعلیم ہے اور مستحسن اقدام ہے لیکن جو چیزیں اسلام نے مسلمانوں کیلئے مختص کر رکھی ہو مثلاً زکوٰۃ یا قربانی وغیرہ تو وہ چیزیں غیر مسلم کو نہیں دی جاسکتیں جب آپ نے یہ تبلیغ فرمائی تو ہندوؤں کی طرف سے آپ کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ ہندوؤں نے باقاعدہ آپ سے باز پرس بھی کی لیکن آپ نے بے جھجک جواب دیا کہ ہم نہیں روکتے بلکہ ہمارا مذہب روکتا ہے، جیسے آپ کا دھرم جتنی اجازت دیتا ہے اتنا ہی آپ برتاؤ ہمارے ساتھ کرتے ہیں" آپکے اس طرز استدلال اور حق گوئی دیباکی کے کارن یہ رسم ختم ہوئی اب قربانی کا گوشت صرف مسلمانوں ہی میں تقسیم ہوتا ہے۔

شادی بیاہ کے مواقع پر بالکل ہندوانہ طور طریقے تھے۔ حضرت فقیہ ملت نے اسکے خلاف بھی عملی اقدام کئے اور خود شادی ان کی شادی اوجھا گنج کی تاریخ میں پہلی شادی تھی جو مکمل اسلامی تعلیمات کا آئینہ تھی جو لوگوں کے لئے اسلامی شادی کا مکمل نمونہ بنی اور اس نے رسم رواج کا رخ موڑ دیا۔ ایک اور چلن جو آپ نے تبدیل کروایا وہ عورتوں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا لازم تھا۔ عام طور پر عورتیں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔ حضرت فقیہ ملت نے مسئلہ سمجھایا کہ صرف مجبوری میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں جبکہ کھڑے ہونے کی سکت ہی نہ ہو۔ اب الحمدللہ عورتیں کھڑی ہو کر ہی نماز

پڑھتی ہیں۔

ایک اور بھیانک رسم جو آپ کی حکمت عملی سے مٹی وہ میت کا کھانا تھی۔ یہ رسم اتنی پختہ تھی کہ اگر کسی غریب کے پاس گنجائش نہ ہوتی تو اسے باقاعدہ پنچایت بلا کر سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہونا پڑتا۔ دیر تک وہ غریب معافی مانگتا رہتا، لوگ اسے طرح طرح کے طعنے دیتے اور باتیں بناتے، وہ سب کی خرافات سنتا اور بار بار لجاجت کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر اپنی مجبوریاں گنواتا تب جا کر بڑی مشکل اور ذلت و رسوائی کے ساتھ اس کی معافی منظور کی جاتی اور ساتھ ہی وہ شخص آئندہ پنچایت میں بات کرنا چاہتا تو لوگ کہتے تو کیا بات کرتا ہے تیرا باپ مر گیا اور تو ابھی تک برادری کو کھانا نہ کھلا سکا۔ حضرت فقیہ ملت نے اس ظالمانہ اور جاہلانہ رسم کا توڑ اس طرح کیا کہ آپ نے اپنے والدین کی میت پر کھانا بالکل نہ پکایا اور جو پیسہ کھانے وغیرہ پر لگنا تھا وہ مسجد میں دیکر اس کا ثواب والدین کی ارواح کو بخش دیا۔ آپ کی بھاری بھرکم مذہبی شخصیت پر کوئی پنچایت انگلی نہ اٹھا سکی اور اس طرح ایک مکروہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ الغرض "اوجھا گنج" والوں کے لئے آپ کی ذات ایک ایسی رحمت ثابت ہوئی جس کے سایہ میں اسلامی زندگی گذارنا آسان ہو گیا۔ رسومات کی کڑی دھوپ میں سڑنے والے لوگ شریعت و سنت کی گھنی چھاؤں میں آ کر سکھ کا سانس لینے لگے۔

آپ نے "اوجھا گنج" میں ۲ سال باقاعدہ تدریس فرمائی پھر صوبہ بہار کے شہر "جمشید پور" میں کچھ عرصہ ایک سکول میں پڑھاتے رہے پھر ضلع بستی کے علاقے بھاؤ پور میں تدریسی خدمات انجام دیں اور بالآخر ۱۹۵۶ء میں جب براؤن شریف کے فیض الرسول سکول کو دارالعلوم فیض الرسول بنا دیا گیا تو آپ نے وہاں مستقل مدرس کی حیثیت میں پڑھانا شروع کیا اور یہی مدرسہ فیض الرسول براؤں شریف آپکی اصلی پہچان بنا اور آپ براؤں شریف کے مفتی کی حیثیت سے پورے بھارت میں مشہور ہوئے۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۳ء تک آپ تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ فتاویٰ نویسی بھی کرتے رہے۔ آپکے فتوے مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہے اور دنیا بھر میں مقبول ہوئے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان ہالینڈ اور افریقہ تک سے آپ کے پاس

سوالات آتے اور آپ ان کے تسلی بخش جواب عنایت فرما کر دینی رہنمائی کا حق ادا کرتے۔ ۱۹۸۳ء کے بعد فتاوٰی نویسی سے ریٹائرمنٹ لے لی اور زیادہ توجہ تدریسی امور نمٹانے پر مرکوز کردی۔

تصنیف وتالیف کے شعبے میں آپ کی پہلی کاوش "گلدستہ مثنوی" تھی جو حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ حکایتوں کے انتخاب پر مبنی تھی۔ اس کے بعد آپ کی اور کئی کتابیں آئی مثلاً معارف القرآن، انوار شریعت المعروف اچھی نماز، حج وزیارت، محققانہ فیصلہ، باغ فدک اور حدیث قرطاس، ضروری مسائل، نورانی تعلیم چار حصے، خطبات محرم وغیرہ۔ ان سب کتابوں کے علاوہ آپ کی کتابیں انوار الحدیث، اور فقہی پہیلیاں کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہے۔ خاص طور پر انوار الحدیث تو ہر اچھی لائبریری اور ہر صاحب مطالعہ شخص کے گھر کی زینت ہے۔

فقیہ ملت حضرت مفتی جلال الدین احمد امجدی کے بلند پایہ علمی مضامین بھی مختلف مذہبی پرچوں میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں اور آپ کے قارئین کا حلقہ پوری اُردو دنیا میں موجود ہے۔ ایک مرتبہ ۱۹۷۹ء بھارت کے کسی اشاعتی دارے نے ایک بہت بڑی علمی خیانت کا ارتکاب کیا کہ فقہ کی مشہور کتاب ''بہار شریعت'' چھاپی اور جہاں جہاں لفظ "نہ" آیا تھا اسے ختم کر ڈالا اور جہاں "نہ" نہیں آنا چاہیے وہاں "نہ" ڈال دیا اس طرح منفی مسائل مثبت بن گئے اور مثبت منفی ہوگئے۔ جب آپ کی نگاہوں نے اپنے پیرو مرشد کی عظیم تصنیف کے ساتھ ایسی "علمی ادبی شرارت" کو بھانپ لیا تو اس کے خلاف زوردار مضامین لکھے جو الٰہ آباد سے نکلنے والے ماہنامہ "پاسبان" اور براؤن شریف کے آرگن ماہنامہ "فیض الرسول" میں شائع ہوئے۔ اگر بروقت یہ تدارک نہ ہوتا تو منفی سرگرمیوں کے عادی نام کے مسلمانوں کا اگلا پروگرام یہ تھا کہ اس "بہار شریعت" کا حوالہ دے کر اس کے مسائل کو خالی الذہن لوگوں میں بتاتے پھرتے کہ دیکھو "بہار شریعت" میں غلط مسائل درج ہیں لیکن حضرت فقیہ ملت کے قلم نے "رضا کے نیزے کی مار" بن کر فتنہ پرور لوگوں کی سازش کو بے نقاب کردیا۔

حضرت فقیہ ملت کا تقویٰ وطہارت مثالی اور علماء دین کیلئے لائق تقلید ہے۔ آپ نے گھر میں ریڈیو تک نہیں رکھا بلکہ بہوؤں کے جہیز میں بھی قبول نہ کیا۔ آپکا کہنا ہے کہ اگر آج میں ریڈیو خریدوں گا تو کل میری اولاد اس سے اگلا اقدام کریگی اور ضرور ٹی وی خرید لائیگی اور میں "امجدی منزل" کو سینما گھر نہیں بنانا چاہتا۔ آپ نے آج تک کسی سیاستدان کو ووٹ نہیں ڈالا اور نہ ہی اپنے گھر والوں کو ڈالنے دیا تاکہ سیاستدانوں کے غلط کاموں کی ذمہ داری میں ہم شامل نہ ہوں۔

تعلیم کے بارے میں آپ کا نظریہ ہے کہ اگر اسلام کی خدمت کی نیت سے انگریزی پڑھی جائے تو ثواب کا کام ہے لیکن ہم مروجہ نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے خلاف ہیں جس سے عموماً پڑھنے والوں کا ذہن خراب ہوجاتا ہے مذہبی آزادی پیدا ہوتی ہے۔ ماحول بدل جاتا ہے اور بسا اوقات نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک دو پشت کے بعد گھر میں دہریت کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں "میں نے خوشحالی کے باوجود اپنے کسی لڑکے کو انگریزی نہیں پڑھائی اور نہ انشاء اللہ پڑھاؤں گا بلکہ ہر ایک کو نائب رسول ہی بنانے کی کوشش کرونگا۔ ان لوگوں کی راہ کبھی نہیں اختیار کرونگا۔ جو دس سال تک زکوٰۃ خیرات کھا کر علم دین حاصل کئے اور پورے زمانہ طالب علمی میں ایک ایک پیسے کے محتاج رہے پھر عالم ہونے کے بعد جب کسی مسجد یا مدرسے میں ملازم ہو کر خوشحال ہوگئے تو اپنے گھر والوں کو انگریزی پڑھا کر کافروں کی وضع قطع کا دلدادہ بنادیا۔ انہیں فاسقوں کا لباس پہنایا اور گھر سے اسلامی طور طریقہ نکال کر اسے مغربی تہذیب کا گہوارہ بنادیا"۔

حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ اہل سنت کے عظیم مصنف، مدرس، مفتی اور شاعر ہیں اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت صدرالافاضل رحمۃ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں آپ سب سے ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ آپ کی کتابیں اہل سنت کے لئے سرمایہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ حضرت حکیم الامت کا یہ ایک امتیازی وصف ہے کہ آپ نے مسلکی لٹریچر میں سنجیدگی متانت اور معیار تحقیق قائم رکھا اور اپنے مؤقف پر ایسے انداز میں دلائل قائم کئے کہ فریق مخالف کے سلیم الطبع اور سنجیدہ فکر قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایسے بے شمار لوگ آپ کی کتابیں پڑھ کر حق و باطل میں پہچان پیدا کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس وصف کے علاوہ آپ کی تحریروں میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ عظیم عالم دین ہونے کے باوجود اپنے کم پڑھے لکھے قارئین سے اس قدر قریب ہو کر بات کرتے ہیں کہ قاری آپ کی بلند قامت علمی شخصیت سے مرعوب ہونے کی بجائے مستفید ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کی بات لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگتی ہے۔ آپ کے اسلوب نگارش کا یہ بھی خاصہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں میں آہستہ آہستہ ایسی استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ قاری خود بخود ارتقائی مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ اس کے ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں اور علم و عرفان کے تازے جھونکے اس کی فکر کو پاکیزگی، روح کو سرشاری اور قلب کو روشنی عطا کرنے لگتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت نے حضرت مولانا محمد یار خان رحمۃ اللہ علیہ کے گھر اوجھانی بدایوں میں 1905ء کے قریب آنکھ کھولی۔ والد گرامی سے ناظرہ قرآن پڑھا اور درس نظامی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔

11 سال کی عمر میں آپ نے بدایوں کے مدرسہ شمس العلوم میں حضرت مولانا قدیر بخش

بدایونی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے یہ کوئی 1916ء کا زمانہ ہوگا۔ اس زمانے میں حضرت مفتی عزیز احمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ شمس العلوم میں آخری کتابیں پڑھ رہے تھے۔ اس حوالے سے مفتی عزیز احمد بدایونی آپ کے استاد بھائی ہوئے۔ شمس العلوم میں آپ تقریباً 3 برس زیر تعلیم رہے۔

اس زمانے میں ریاست مینڈھو میں ایک مدرسہ سرکاری سرپرستی میں چلتا تھا۔ جس کا معیار تدریس اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر آپ دیوبندی مدرسین کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہو کر 1919ء مین وہاں داخل ہو گئے۔ اور 4 سال تک پڑھتے رہے۔ یہ بات آپ کے خوش عقیدہ والد گرامی کے لئے بہت ناگوار تھی لہٰذا جب 1922ء میں آپ سالانہ چھٹیاں گزارنے کو گھر آئے تو والد محترم کے حکم اور چچازاد بھائی کی ترغیب سے جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں داخل ہوئے اور آپ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ آپ خود لکھتے ہیں۔

”دیوبندی اساتذہ کے پاس ایک عرصہ تک پڑھنے کے بعد میں یہ سمجھنے لگ گیا تھا کہ علمی تحقیق کا کمال تو بس اسی گروہ مین پایا جاتا ہے۔ لیکن جب خوش قسمتی سے صدرالافاضل مراد آبادی قدس سرہٗ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ کا ایک رسالہ ”عطایا القدیر فی احکام تصویر“ مطالعے کے لئے دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی“۔

جامعہ نعیمیہ میں پڑھائی کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ حضرت صدرالافاضل چونکہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور آپ کی مصروفیات بھی بے شمار تھیں لہٰذا کبھی کبھی تدریس میں ناغہ ہو جاتا جو مفتی احمد یار خان نعیمی کے لئے ناقابل برداشت ہوتا۔ ایک دن مفتی احمد یار خاں نعیمیہ نے اپنا سامان باندھا اور مدرسہ سے کھسک لئے، ابھی چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کسی نے مولانا نعیم الدین مرادآبادی کو صورت حال سے آگاہ کر دیا بس پھر کیا تھا حضرت نعیم الدین مراد آبادی نے فوراً کسی کو دوڑایا کہ احمد یار کو روکو آئندہ ہم اس کی تعلیم کا حرج نہیں ہونے دیں گے۔ لہٰذا استاد محترم نے طالب علم کے اخلاص اور وابستگی کو دیکھتے ہوئے اپنے دور کے مشہور مدرس حضرت مولانا مشتاق احمد کانپوری کو 80 روپے ماہوار کے کثیر مشاہرے پر جامعہ نعیمیہ میں مامور کر لیا اور مفتی احمد یار خاں نعیمی نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مفتی احمد یار خان نعیمی درس نظامی

مکمل کرنے کے بعد جامعہ نعیمیہ میں بھی کچھ عرصہ پڑھاتے رہے پھر استاد محترم کے حکم پر دھوراجی کاٹھیاواڑ چلے گئے وہاں سے کچھ عرصہ کے بعد واپس جامعہ نعیمیہ آگئے اور ایک بار پھر تدریس کی مسند کو رونق بخشی۔

بعد ازاں حافظ الحدیث حضرت مولانا سید جلال الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ بھکھی شریف میں تعینات ہوئے لیکن دل نہ لگا اور واپس بدایوں جانے کی نیت سے لاہور آگئے۔ وہاں سے مولانا پیر سید محمود شاہ گجراتی کے اصرار اور حضرت سید ابوالبرکات کی سفارش پر گجرات تشریف لے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ آج آپ گجرات کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور گجرات آپ کے حوالے سے۔ گجرات میں آپ نے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم فرمایا جو ''نعیمی کتب خانہ'' کے نام سے مشہور ہوا اس ادارے نے دین متین کی خدمت کے ضمن میں بہت خدمات انجام دیں۔ اور آپ کے تتبع میں بہت سے علماء نے اپنے اپنے اشاعتی ادارے قائم کئے اور تجارت کے ساتھ ساتھ خدمت اسلام کا کام بھی آگے بڑھایا۔

گجرات میں آپ نے ''درس قرآن'' شروع کیا جس نے بڑی پذیرائی حاصل کی۔ پاکستان میں ۲ علماء کرام کے ''درس قرآن'' نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ایک امام اہل سنت حضرت سیدنا امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے ملتان شریف میں 18 سال میں ''درس قرآن'' مکمل کیا اور دوسرے حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے گجرات میں 19 سال میں ''درس قرآن'' مکمل کیا۔

آپ نے تدریسی خدمات کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے جامعہ غوثیہ نعیمیہ بھی قائم کیا جو علوم وفنون کی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ عوامی اجتماعات سے بھی خطابات فرماتے رہے اس سلسلے میں راقم نے آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں میں عمر رسیدہ لوگوں سے خوشگوار حیرت کے ساتھ یہ بات سنی کہ حضرت مفتی احمد یار خاں نعیمی یہاں کے دیہات تک میں جلسوں سے خطاب کرنے آیا کرتے تھے اور انکی باتیں اور یادیں آج تک دل ودماغ میں

محفوظ ہیں۔

آپ کی کتابوں میں تفسیر نعیمی، حاشیہ نور العرفان، انشراح بخاری، مراۃ شرح مشکوۃ 8 جلدیں، علم المیراث، جاء الحق، فتاویٰ نعیمیہ، حضرت امیر معاویہ پر ایک نظر، رسائل نعیمیہ، خطبات نعیمیہ، دیوان سالک (شعری مجموعہ) شامل ہیں۔

آپ کے شاعرانہ صلاحیتیں آپ کی بھرپور علمی شخصیت کی اوٹ میں چلی گئیں ورنہ آپ ملک کے معروف شعراء میں شامل ہوتے۔ اگر آج بھی کوئی محقق آپ کی شاعری پر کام کرے تو آپ کی فنی عظمت کے کئی گوشے سامنے آسکتے ہیں۔

راقم نے اپنی کتاب ''بزرگان دین کا نعتیہ کلام'' حصہ اول، دوم، سوم میں آپ کا نعتیہ کلام شامل کیا ہے جو اہل ذوق بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

الغرض حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ وہ شخصیت تھے کہ جن کا خلا آج تک پورا نہ ہو سکا۔ یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کوئی لائبریری حضرت حکیم الامت کی کتابوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

آپ ۳ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ/۲۳۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار ''پاکستان چوک'' گجرات میں آج بھی اہل ذوق میں روحانی فیض کے چشمے کا درجہ رکھتا ہے۔ جس سڑک پر آپ کا مزار ہے اس کا نام سرکاری طور پر ''مفتی احمد یار خان نعیمی روڈ'' رکھا گیا ہے۔

حضرت مولانا غلام قادر اشرفی رحمۃ اللہ علیہ

لاہور سے اسلام آباد جائیں تو راستہ میں ''لالہ موسیٰ'' کے مقام پر ایک خوبصورت مزار مبارک اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ خوش عقیدہ لوگوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے یہ مزار شریف اشرف المشائخ حضرت مولانا غلام قادر اشرفی کا ہے۔ جو صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ کے تلامذہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ بھارتی پنجاب کے قصبہ ''فرید کوٹ'' میں ہفتہ ۱۴ محرم الحرام ۱۳۲۴ھ یعنی ۱۰ مارچ ۱۹۰۶ء میں میاں باغ علی چشتی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے کہ اکثر بڑے لوگوں کی طرح آپ بھی یتیم ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۲ء تک مقامی سکول میں زیر تعلیم رہے۔ غالباً ۱۹۲۴ء میں حضرت صدر الافاضل کے مدرسہ اہل سنت (جامعہ نعیمیہ مراد آباد) میں داخل ہوئے اور جامعہ نعیمیہ میں پڑھائی کے دور میں ہی مختلف تعلیمی اداروں اور اساتذہ سے جز وقتی طور پر سنسکرت، ہندی، گورمکھی اور گیانی زبانیں بھی سیکھیں۔

۱۹۲۵ء میں جب مراد آباد میں سنی کانفرنس منعقد ہوئی تو جامعہ نعیمیہ کے دیگر طلباء کے ساتھ آپ نے بھی کانفرنس کے انتظامات اور مسلمانوں کی خدمت میں بڑھ چڑھ کا حصہ لیا۔

جامعہ نعیمیہ میں پڑھائی کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک دن مولانا غلام قادر اشرفی دیگر طلباء کے ساتھ دیوبندیوں کے جلسے میں چلے گئے۔ آپ کے وہاں جانے کی غرض یہ تھی کہ بدمذہبوں کے عقائد کے بارے میں معلومات ہوں گی اور ان کے عقائد کا رد قرآن و حدیث کی روشنی میں بآسانی کیا جا سکے گا۔ جب حضرت صدر الافاضل کو معلوم ہوا کہ جامعہ نعیمیہ کے طلباء نے بدمذہبوں کے جلسے میں شرکت کی ہے تو آپ بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کی کسی بھی محفل میں جانا درست نہیں ہے۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ اپنے عقائد میں انتشار و فتنہ کا احتمال ہوتا ہے۔ سزا کے طور پر ان طلباء کو ایک دن بھوکا رکھا گیا۔ بلکہ ساری

رات جاگنے، عبادت کرنے اور توبہ کرنے کا حکم فرمایا۔ طلباء نے ساری رات توبہ اور عبادت کرنے کے علاوہ دیوبندیوں کے جلسے میں جو کچھ سن کر آئے تھے اس کے رد میں ایک مضمون تحریر کیا۔ اگلے دن وہ مضمون جب صدر الافاضل کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو آپ بہت خوش ہوئے اور تمام طلباء کو معافی دے دی اور فرمایا کہ الحمدللہ ہمارے طلباء کے عقائد اتنے پختہ و مضبوط ہیں کہ کوئی بدعقیدہ ان پر غالب نہیں آ سکتا۔

حضرت مولانا غلام قادر اشرفی اپنے استاد محترم حضرت صدالافاضل کے پیر بھائی بھی تھے کیوں کہ آپ بھی اپنے استاد محترم کی طرح بدر اشرفیت سرکار کلاں پروردہ محبوبی حضرت سید علی حسین کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بعد ازاں حضرت قطب مدینہ ضیاء الدین مدنی نے بھی آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ تعلیم سے فراغت پانے کے تین سال بعد تک بھارتی پنجاب کے ضلع فیروز پور میں خطبہ جمعہ اور تدریسی و تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۳۵ء میں جب امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ''تحریک شہید گنج'' چلی تو آپ نے اس میں بھرپور انداز میں حصہ لے کر غیرت ایمانی کا ثبوت دیا۔ اس عرصہ میں آپ مشرقی پنجاب سے نقل مکانی کر کے مغربی پنجاب کے ضلع گجرات کے علاقہ لالہ موسیٰ میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اور شہر کی مرکزی مسجد میں بلا معاوضہ خطابت کا سلسلہ شروع کیا جو دم آخر تک جاری رہا۔ ۱۹۳۹ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانان برصغیر سے یوم نجات منانے کی اپیل کی تو آپ نے ''مجلس تبلیغ الاسلام لالہ موسیٰ'' کے زیر اہتمام یوم نجات منایا۔ اور لالہ موسیٰ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس وقت (سابق وزیر اعظم پاکستان) ملک فیروز خاں نون اور ممتاز مسلم لیگی رہنما سردار شوکت حیات خان آپ کے ساتھی تھے۔ مقامی مسلم لیگ میں آپ کا بے حد احترام پایا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ ۱۹۴۵ء کے مندرجہ ذیل تاریخی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

قائداعظم کشمیر سے لاہور آ رہے تھے اور مختلف شہروں میں رُک کر مختصر خطاب کرنا ان کے شیڈول میں شامل تھا۔ یہ بات اٹل تھی کہ قائداعظم شیڈول کے علاوہ کہیں نہیں رُکتے اور اگر کوئی

ساتھی انہیں رُکنے کا کہے تو وہ ان کے عتاب سے نہیں بچ سکتا۔

قائداعظم کے سفری شیڈول میں لالہ موسیٰ کا کوئی پروگرام نہیں تھا اور ادھر لالہ موسیٰ کے مسلم لیگی رہنماؤں اور کارکنوں نے لالہ موسیٰ میں جھنڈے لگا کر اور سڑک پر خوبصورت آرائشی محرابیں بنا کر قائداعظم کے شاندار استقبال کا پروگرام بنا رکھا تھا اور وہاں کے مخلصین نے ایک خطیر رقم قائداعظم کی نذر کرنے کیلئے ایک خوبصورت تھیلی میں جمع کر رکھی تھی۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ کون ہمت کر کے قائداعظم کو روکے انہیں خطاب کی دعوت دے اور یہ تھیلی پیش کرے آخر کار تمام مسلم لیگی رہنماؤں نے متفقہ طور پر مولانا غلام قادر اشرفی کو آگے کیا۔ اب حضرت مولانا غلام قادر اشرفی نے قائداعظم کو کس طرح روکا کس طرح خطاب کروایا اور کس طرح نذرانہ پیش کیا یہ انہیں کی زبانی سنئے اور سر دھنئے۔

"قائداعظم بذریعہ کار کشمیر سے واپس لاہور تشریف لا رہے تھے اور راستہ میں انہیں جا بجا جلسوں سے خطاب کرنا تھا۔ ہم نے بھی لالہ موسیٰ میں استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور نذرانہ کی تھیلی کا بھی بندوبست کیا۔ جی ٹی روڈ پر میل ڈیڑھ میل تک جھنڈیاں اور محرابیں بنوائیں، مسلم لیگ کے جھنڈے لگائے اور تمام علاقہ میں آدمی دوڑا کر صبح تک ہزاروں آدمی جمع کر لئے۔ پنڈال میں میلے کا سماں تھا، ہر طرف چہل پہل تھی، سٹیج تیار ہو چکا تھا۔ شامیانے نصب تھے لیکن لطف کی بات یہ کہ نہ تو قائداعظم کو اس کی اطلاع تھی اور نہ ہی ان کے پروگرام میں لالہ موسیٰ ٹھہرنے کا اندراج تھا۔

دوپہر کو قائداعظم تشریف لائے تو فضا نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر، مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم زندہ باد، لے کے رہیں گے پاکستان، آنکھوں کا نور پاکستان، دل کا سرور پاکستان، سے گونج اُٹھی۔ لالہ موسیٰ کی فضا میں انتہائی جوش و خروش تھا۔ قائداعظم نے پوچھا، یہ کونسی جگہ ہے؟ عرض کیا گیا، لالہ موسیٰ۔ فرمایا! ہمارے پروگرام میں شامل نہیں۔ ہم گجرات ٹھہریں گے۔

سڑک پر استقبال کے لئے چوہدری غلام احمد قادری جنرل سیکرٹری مسلم لیگ لالہ موسیٰ مع رفقاء موجود تھے۔ میری ڈیوٹی اسٹیج پر تھی۔ جب قائداعظم نے ٹھہرنے سے انکار کر دیا اور کار

سے نہ اُترے تو چوہدری صاحب نے مجھے آواز دی۔ وہ جا رہے ہیں یہیں آ کر مل لو۔ میں نے فوراً آ کر سلام عرض کر کے ہاتھ ملایا اور عرض کیا۔ ذرا باہر آ کر کھڑے ہو جائیں تا کہ لیگ کے کارکن جو دور دراز سے راتوں رات پیدل سفر کر کے یہاں پہنچے ہیں، اپنے محبوب قائد کو ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ سن کر قائداعظم موٹر کے پائیدان پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پھر عرض کیا، آپ زمین سے فٹ ڈیڑھ فٹ بلندی پر کھڑے ہیں۔ اگر چھ سات فٹ اُونچے کھڑے ہوں تو زیادہ لوگ دیکھ سکیں گے۔ فرمانے لگے کیوں؟ میں نے عرض کیا۔ اس لئے کہ میں مسلم لیگ کا جنم ساتھی ہوں اور آپ اس کے صدر ہیں۔ فرمایا، کیسے؟ میں نے کہا میری پیدائش ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور مسلم لیگ کا قیام بھی ۱۹۰۶ء میں ہوا چونکہ میں اور مسلم لیگ اکٹھے پیدا ہوئے لہٰذا میں اس کا جنم ساتھی ہوں۔ اس قائد اعظم نے وفورِ جذبات سے مجھے گلے لگا لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر تشریف لائے اور فرمایا۔

"حضرات! میرا مولانا سے لڑائی ہوا، تو وہ لڑائی پیار اور محبت کا تھا، یہ سامنے انڈیا کا نقشہ ہے، میں اس پر پاکستان کو اُبھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں، منزل بالکل قریب ہے، آپ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر میرے ہاتھ مضبوط کریں، اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو"۔

اس دلکش اور وجد آور خطاب کے بعد "مسلم لیگ زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے نعروں کی گونج میں میں نے نذرانہ کی تھیلی پیش کی اور ان کا قافلہ شاداں و فرحاں عازمِ گجرات ہوا۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں تاریخ ساز آل انڈیا بنارس سنی کانفرنس میں آپ نہ صرف خود شریک ہوئے بلکہ مغربی پنجاب سے بہت سے ساتھی علماء کو بھی لے کر گئے۔ سنی کانفرنس میں علمائے اہل سنت کی طرف سے تحریک پاکستان کی مکمل تائید وحمایت کے بعد آپ نے مسلم لیگ کے لئے اپنی جدوجہد کو اور تیز کر دیا اور اس کی پاداش میں کئی مرتبہ جیل کاٹی۔ مختلف اوقات میں جو قید آپ نے کاٹی اگر اسے شمار کیا جائے تو تقریباً ۴ سال کا عرصہ بنتا ہے۔ جب بھی آپ جیل سے رہا ہو کر آتے تو بلا خوف وخطر پہلے سے بڑھ کر تحریک پاکستان کے لئے کام کرتے۔ لیکن جب پاکستان بن گیا اور یہاں پاکستان بنانے والوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کو نوازا جانے لگا تو آپ مسلم لیگ کو چھوڑ

کر جمعیت علمائے پاکستان میں شامل ہو گئے اور ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے مطالبے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ۱۹۵۳ء میں جمعیت علمائے پاکستان کے صدر خلیفہ اعلیٰ حضرت ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری رضوی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں تحریک ختم نبوت میں مجاہدانہ کردار ادا کیا۔

۱۹۷۰ء میں حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں جب جمعیت نے عام انتخابات میں حصہ لیا تو آپ نے اس فیصلہ کا بھرپور خیر مقدم کیا اور اس کے نمائندوں کی ہر طرح مدد کی اور انہیں کامیاب کرانے میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ ۱۹۷۴ء میں جب جمعیت علمائے پاکستان کے لیڈر مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ نے قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو مرتد قرار دلوانے کی تحریک شروع کی تو جن علماء نے اسمبلی سے باہر رہ کر اس مسئلے پر کام کیا اور ارکان اسمبلی کو قرارداد منظور کرنے کے لئے تیار کیا ان میں امام اہل سنت غزالی زماں حضرت امام احمد سعید کاظمی، حضرت علامہ سیّد محمود احمد رضوی، حضرت مفتی محمد حسین نعیمی اور دیگر علمائے اہل سنت کے ساتھ آپ نے بھی اس تاریخی جدوجہد میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں قادیانیوں کو سرکاری طور پر مرتد اور غیر مسلم قرار دیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ میں آپ نے قائد اہل سنت امام شاہ احمد نورانی کی قیادت میں پیرانہ سالی کے باوجود نوجوانوں کی طرح جوش و ولولہ سے حصہ لیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اسلام کے نام پر چلنے والی ہر تحریک میں حصہ لیا مگر ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ آپ کی زندگی کی آخری تحریک ثابت ہوئی اور ۱۹۷۹ء میں آپ اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں سرخروئی کے ساتھ حاضر ہو گئے۔

آپ نے زندگی کو ہمیشہ ایک مجاہد کی طرح گزارا، زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود تصنیف و تالیف سے نظر نہیں چرائی بلکہ مختلف موضوعات پر آپ نے کئی علمی کتابیں یادگار چھوڑیں۔

آپ کی ایک کتاب ''شانِ اولیاء'' راقم کی نظر سے گزری ہے جسے دارالفیض گنج بخش ۵۵ حکیم موسیٰ روڈ، لاہور نے شائع کیا ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ دشمنوں سے

بھی بڑے طریقہ اور سلیقہ سے کلام کرتے ہیں۔ اسماعیل دہلوی کی فتنہ ساز کتاب تقویت الایمان میں ''غلام محی الدین'' ''غلام معین الدین'' ''پیر بخش'' وغیرہ نام رکھنے کو شرک بتایا گیا ہے۔ آپ اس کے رد میں اپنی کتاب ''شانِ اولیاء'' کے صفحہ ۲۹ پر فرماتے ہیں۔ ''برکت کے لئے اپنی اولادوں کے نام ان (بزرگوں) کے نام پر رکھنا، یہ سب شرک قرار دے دیا اور کروڑوں مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ اسلام سے خارج کر دیا پھر یہ کہ اس دعوے پر نہ دلیل ہے نہ برہان، نہ کوئی حدیث نہ قرآن، نہ ثبوت نہ شہادت، نہ کوئی حوالہ نہ کسی کتاب کی عبارت، حالانکہ دیکھئے مولوی قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند کے دادا کا نام ''غلام شاہ'' اور پردادا کا نام ''محمد بخش'' ہے۔ مولوی یعقوب کے والد کے نانا کا نام ''خواجہ بخش'' ہے۔ ان کے والد کے استاد کا نام ''قلندر بخش'' ہے۔ رشید احمد گنگوہی کے دادا کا نام ''پیر بخش'' پردادا کا نام ''غلام حسن'' اور پردادا کے والد کا نام ''غلام علی'' اور نانا کا نام ''فرید بخش'' ہے۔ رشید احمد گنگوہی کے ایک استاد کا نام ''قطب بخش'' اور دوسرے کا نام ''محمد غوث'' ہے۔

یہ ہے مولانا غلام قادر اشرفی کی طرز نگارش، عالمانہ گرفت اور معیار تحقیق جس کے سامنے عقل سلیم کو تسلیم کے علاوہ کوئی راستہ سوجھائی نہیں دیتا۔

ضرورت اس چیز کی ہے کہ آپ کی کتابوں کو شائع کر کے سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں کی زینت بنایا جائے اور دوسرا یہ کہ آپ کے مفصل سوانح حیات مرتب کئے جائیں۔ جس سے ماضی کی مختلف تحریکوں کے بعض پہلو سامنے آئیں گے۔ جو محققین کی دلچسپی کا سامان فراہم کریں گے اور نوجوان نسل کو اپنے تابناک ماضی کو سامنے رکھ کر بہتر مستقبل کی تلاش میں مدد دیں گے۔ حکیم اہل سنت حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے قافلہ عشق و اخلاص کے ایک رکن ''متین کاشمیری'' اس سلسلے میں تگ و دو کر رہے ہیں۔

امام نورانی اوران کا عظیم المرتبت خاندان

جب مغل فرماں روا ظہیر الدین بابر نے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے استاد محترم حضرت صوفی حمید الدین خجندی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہندوستان چلنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول کر لی اس طرح ہندوستان میں اس صدیقی خاندانی کی باقاعدہ آبادکاری کا سلسلہ شروع ہو۔

اس صدیقی خاندان کے افراد ضرب وحرب میں بھی ماہر تھے لیکن زیادہ تر ان کا میدان تبلیغ وارشاد ہی رہا۔

انیسویں صدی ہجری میں صوفی حمید الدین خجندی علیہ الرحمۃ کی نسل میں سے میرٹھ میں دو بھائیوں ''علامہ عبدالحکیم جوشؔ میرٹھی'' اور ''مولوی اسماعیل میرٹھی'' نے بڑی شہرت پائی علامہ عبدالحکیم جوشؔ میرٹھی نے تو شعروشاعری کے ساتھ اپنے آباؤاجداد کی طرح رشدوہدایت کی مسند کو بھی رونق بخشی لیکن اسماعیل میرٹھی نے فقط اُردو شعروادب کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا بہر حال دونوں بھائی اپنے اپنے شعبہ میں استاد مانے جاتے تھے۔

1857ء میں جب انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو علامہ عبدالحکیم جوشؔ میرٹھی جنگ آزادی کے مجاہدین میں شامل تھے اور اسماعیل میرٹھی سر سیّد احمد خان کی تحریک کے ہمنوا اور سر سیّد کے قریبی ساتھی شمار ہوتے تھے۔ میرٹھ میں ان کے نام سے ''اسماعیل گرلز کالج'' آج بھی سرکاری سطح پر قائم ہے۔

علامہ عبدالحکیم جوشؔ میرٹھی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی فرزند عطا فرمائے اور وہ سب اسلام کے عظیم سپوت ثابت ہوئے۔

(۱) سب سے بڑے مولانا احمد مختار صدیقی اپنے خاندانی پس منظر کے علاوہ اس وجہ سے بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے کہ آپ کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی سے اجازت وخلافت

حاصل تھی۔ بمبئی میں ایک عرصہ تک دینی خدمات انجام دینے کے بعد آپ جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن تشریف لے گئے اور ڈربن میں مرکزی جامع مسجد کی بنیاد رکھی اور اس مسجد میں مسلسل ۳۵ سال خطیب رہے آپ ایک عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے آپ کی تبلیغی مساعی سے ڈربن میں کئی اسلامی ادارے قائم ہوئے اور مسلمانوں کو تحفظ حاصل ہوا۔ آپ کا انتقال ۱۹۳۸ء میں میرٹھ میں ہوا۔

(۲) مولانا نذیر احمد خجندی بمبئی میں رہائش پذیر تھے اور قائداعظم محمد علی جناح کے دوست اور مشیر تھے یہ وہی مولانا نذیر احمد خجندی ہیں جن کے ہاتھ پر قائداعظم کی اہلیہ رتن بائی نے اسلام قبول کیا تھا اور قائداعظم کا نکاح بھی آپ ہی نے پڑھایا تھا ''آزاد میدان پارک'' بمبئی میں قائداعظم اکثر جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی آپ کے پیچھے ادا کرتے تھے۔ آپ کے دیگر بھائیوں میں (۳) مولانا بشیر احمد صدیقی، (۴) مولانا صدیق احمد صدیقی، (۵) مولانا خلیل احمد صدیقی، (۶) اور حمید احمد صدیقی اپنے دور کے جید عالم اور نعت گو شاعر تھے۔

مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی بھی امام احمد رضا کے خلیفہ تھے اور اعلیٰ حضرت کے تمام خلفاء میں اس لئے ممتاز تھے کہ آپ نے ''فکر رضا'' کو یورپ کے کلیساؤں سے لے کر افریقہ کے صحراؤں تک وسعت دی۔

آپ نے انگریزوں کے چوٹی کے عالم اور دانشور ''جارج برنارڈ شا'' کے ساتھ علمی مکالمہ کرکے اسے اسلام کی حقانیت پر قائل کیا۔ آپ کی تبلیغ سے عوام الناس کے علاوہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر، سیاسی رہنما، وزراء، حکومتی اہلکار، حکام بالا اور پڑھے لوگ بھی بے حد متاثر ہوتے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ آپ تنہا کئی اداروں مسجدوں، مدرسوں، کالجوں کی دیکھ بھال کرتے اور نئے مسلمان ہونے والوں کی ایسی تربیت فرماتے کہ وہ اچھے مسلمان بن کر اوروں کے لئے نمونہ ثابت ہوتے۔

شاہ عبدالعلیم صدیقی کے بڑے فرزند شاہ محمد جیلان لندن میں مقیم رہے لیکن آخری عمر میں پاکستان میں بھی کافی وقت گزارا اور نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لئے امام نورانی کے ساتھ

کوشاں رہے آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں شاہ احمد نورانی سے عمر میں بڑا ضرور ہوں مگر مقام و مرتبہ میں شاہ احمد نورانی مجھ سے بہت بڑے ہیں اور میرے والد کے حقیقی جانشین ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے الیکشن میں امام نورانی کی انتخابی مہم میں آپ بنفس نفیس شریک تھے اور کارکنوں کی طرح کام کرتے تھے۔ ضعف اور بزرگی کے باوجود ٹرکوں اور ٹرالوں پر سفر کرنا، جلسوں سے خطاب کرنا۔ میٹنگوں میں شریک ہونا اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرنا آپ کے نمایاں اوصاف تھے اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود عاجزی اور انکساری سے پیش آنا آپ کی عادت ثانی تھی آپ چند سال قبل انتقال فرما گئے ہیں۔

امام شاہ احمد نورانی ۷ار مضان المبارک ۱۳۴۴ھ میں پیدا ہوئے پہلے میرٹھ اور پھر الہ آباد سے تعلیم حاصل کی جب پاکستان بنا تو آپ زیر تعلیم تھے تعلیم مکمل ہونے پر آپ کراچی آگئے مولانا خود فرمایا کرتے تھے کہ جب ہمارا خاندان ہجرت کر کے کراچی آیا تو کئی دن ہمارے خاندان نے کھلی سڑک پر خیمہ میں گزارے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے والد صاحب سے کہا کہ آپ کی میرٹھ میں جائیداد تھی لہذا آپ کلیم داخل کر کے کوئی پلاٹ وغیرہ الاٹ کرالیں تو آپ کو والدہ صاحب نے جواب دیا کہ ”میں نے سنت رسول ﷺ سمجھ کر ہجرت کی ہے میں کلیم داخل کروا کر سنت کا ثواب ضائع نہیں کرنا چاہتا“۔

پاکستان آنے کے بعد مولانا نورانی نے مسلسل ۲۰ برس تک افریقہ اور یورپ میں دین اسلام کا پیغام پہنچایا عیسائیت کے حملوں اور مرزائیت کی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے والد گرامی کے قائم کردہ تمام اداروں کی مکمل نگہداشت کی اور ان کی تعمیر و ترقی میں دن رات کوشاں رہے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا اور نوعمری کے باوجود آپ ملکی سطح پر ہونے والے جید علماء کے اجلاسوں میں شریک رہے۔ جسٹس منیر رپورٹ کے صفحہ ۸۰ پر ہے کہ ”علماء کی ایک کمیٹی وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے مذاکرات کے لئے تشکیل دی گئی اس میں جمعیت علماء پاکستان کے تین لیڈر تھے علامہ سید ابوالحسنات مولانا مفتی صاحب داد خان اور مولانا شاہ احمد نورانی“

۱۹۷۰ء میں آپ نے عملی سیاست میں حصہ لیا اور ایسے عظیم کارنامے انجام دیئے کہ ان پر کئی کتابیں مکمل کی جاسکتی ہیں اور وہ ڈاکٹریٹ کے مقالے کا عنوان بنائے جاسکتے ہیں۔ آج صدر وزیر اعظم صوبائی و وفاقی وزراء سینیٹرز وغیرہ اپنے عہدے سنبھالنے سے پہلے جو حلف اٹھاتے ہیں وہ مولانا ہی کے مقدس قلم کا شاہکار اور پاکیزہ فکر کا آئینہ دار ہے۔ ”۷۳ء آئین پاکستان“ کو متفقہ آئین دینا اور احمدیوں کو کافر مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے کر پاکستان کے کلیدی عہدوں سے ہٹانا آپ ہی کا کمال ہے آپ سے پہلے بھی بہت سے مسالک کے اکابر علماء سیاست میں رہے لیکن متذکرہ بالا دینی امور کے لئے قسام ازل نے روز ازل ہی سے آپ کا نورانی نام لوح محفوظ میں لکھ چھوڑا تھا۔

ایں	سعادت	بزور	بازو	نیست
تا	نہ	بخشد	خدائے	بخشندہ

یہ بات بھی فقر و درویشی کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی کہ آپ دنیا بھر کی بے شمار عالمی تنظیموں کے سرپرست، پیر طریقت، جید عالم، دو مرتبہ ایم این اے اور دو مرتبہ سینیٹر رہنے کے باوجود نصف صدی کرائے کے مکان میں رہائش پذیر رہے۔

ہر دور حکومت میں آپ کو وزارت گورنری اور وزارت اعلیٰ کی پیشکش ہوتی رہی مگر امام نورانی کا یہ تاریخ ساز جملہ نظام مصطفیٰ کے سپاہیوں کا لہو گرماتا رہے گا کہ ”میں خود اقتدار میں نہیں آنا چاہتا نظام مصطفیٰ کو اقتدار میں دیکھنا چاہتا ہوں شاہ احمد نورانی کو وزارتوں کی پیشکش نہ کرو ملک میں نظام مصطفیٰ نافذ کر دو شاہ احمد نورانی تمہارے دفتر میں جھاڑو دینے کے لئے بھی تیار ہے“۔

اور مولانا کا یہ جملہ بھی نفاذ اسلام کے دعویداروں کے لئے نشان منزل ہے کہ ”ہماری منزل اسلام ہے اسلام آباد نہیں“

۸۰ سال کی عمر میں امام نورانی شوال ۱۴۲۴ھ بمطابق ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء کو ہمیں بلکہ ہمیں ہی نہیں تمام اسلامی دنیا کو داغ یتیمی دے گئے۔ آپ عبداللہ شاہ غازی کے احاطے میں اپنی والدہ حضرت امۃ الروف رحمۃ اللہ علیہا کے قدموں میں مدفون ہوئے (گویا آپ کو دنیا ہی میں جنت مل گئی)

مولانا کی بڑی بہن علوم اسلامیہ کی ماہر حضرت امت الصبوح رحمۃ اللہ علیہا نے بھی اپنے خاندان کی عظیم علمی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے کراچی کے علاقے شمالی نظام آباد میں ''المرکز الاسلامی'' کے نام سے ایک بے مثال دینی اور تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ جہاں اہل سنت کی پردہ دار بہنوں اور بیٹیوں کو اسلامی تعلیم و تربیت سے مالا مال کر کے معاشرے کو اسلامی طرز میں ڈھالنے کے لئے عملی سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

حضرت امت الصبوح کے شوہر حضرت مولانا فضل الرحمٰن انصاری متوفی ۱۹۷۴ء شاہ عبدالعلیم صدیقی کے خلیفہ تھے آپ اپنے عہد کے عظیم مصنف تھے مگر آپ کی زیادہ تر کتابیں عربی اور انگریزی زبانوں میں ہیں اس لئے پاکستانی عوام کی پہنچ سے دور رہیں لیکن اسلام دنیا کے علمی حلقے ان سے بخوبی واقف ہیں اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جوانی کے دنوں میں آپ علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ رہے لیکن بعدازاں علی گڑھ کو چھوڑ کر اپنی ساری زندگی اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کردی آپ کا حلقہ ارادت بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔

امام نورانی کی چھوٹی ہمشیرہ ڈاکٹر فریدہ احمد، ایم این اے بھی امام نورانی کی طرح متحرک اور فعال مبلغہ ہیں پچھلے تیس سالوں سے کراچی میں خواتین کی محافل میلاد، درس قرآن اور اسلامی تربیتی نشستوں سے خطاب فرماتی ہین آپ کا لب ولہجہ اور انداز خطابت امام نورانی ہی کی اتباع کرتا ہے آپ جمعیت علمائے پاکستان شعبہ خواتین کی سربراہ بھی رہیں کراچی کے علاقے گلشن اقبال میں آپ نے عظیم الشان ''خواتین اسلامک مشن ہال'' تعمیر کرایا جو آپ کے حسن و تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے بے شمار خواتین اسلام ''خواتین اسلامک مشن ہال'' اور اس سے ملحقہ دینی دارالعلوم سے علم حاصل کر چکی ہیں اور ان میں سے بعض خوش نصیب بہنیں مبلغہ بن کر اپنے اپنے خاندان اور حلقوں میں اعتقادی اور اصلاحی خدمات انجام دے رہی ہیں ڈاکٹر فریدہ احمد کسی زمانے میں خواتین کی علمی و فکری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک مجلہ بھی شائع کیا کرتی تھیں جو بعد میں حالات کی نذر ہو گیا۔ جب پاکستان کی اسمبلی نے تحفظ نسواں بل کے نام

سے بے حیائی کا بل پاس کیا تو آپ نے غیرت اسلامی کا ثبوت دیتے ہوئے اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔

ڈاکٹر فریدہ احمد کے شوہر محترم جناب محمد احمد صدیقی ماہر معاشیات ہیں اور پاکستان کے ممتاز ماہرین معاشیات میں گنے جاتے ہیں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ایک امریکی تحقیقی ادارے نے دنیا کے مشہور ماہرین معاشیات کی ایک فہرست شائع کی تھی اس میں پاکستانی ماہرین معاشیات میں جناب محمد احمد صدیقی کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ آپ بلند پایہ صحافی بھی ہیں۔ کسی دور میں آپ کراچی سے ہفت روزہ ''احوال'' نکالتے تھے اور وہ پرچہ سنی صحافت کا نمائندہ پرچہ سمجھا جاتا تھا۔ راقم کے صحافتی کیریئر کا آغاز اس پرچے سے ہوا۔ اپنے عہد میں وہ پرچہ حق گوئی اور بے باکی کا علمبردار اور صحافت میں دیانت کے اصول پر کار فرما تھا ایسے پرچوں کو نہ تو سرکاری اشتہار ملتے ہیں اور نہ کوئی اور ذریعہ ایسا ہوتا ہے کہ انہیں زندہ رکھا جا سکے۔ اگر اسے نظر نہ لگی ہوتی تو آج وہ پاکستان کے صف اول کے جریدوں میں شمار ہوتا۔ محمد احمد صدیقی جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی رہنما رہے اور تقریر و تحریر میں بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے امام نورانی کے سچے شیدائی اور نامساعد حالات میں ڈٹ کر اپنے قائد کا ساتھ دینے والے کارکن تھے لیکن آج کل ضعف اور بزرگی کے باعث گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

''امام نورانی کی زوجہ محترمہ'' آپ کا تعلق آفتاب پنجاب حضرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہے حضرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی وہ شخصیت ہیں کہ آپ ہی نے حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی کو مجدد الف ثانی کا خطاب دیا تھا اور حضرت مجدد الف ثانی آپ کو ''آفتاب پنجاب'' کہہ کر پکارا کرتے تھے آپ کی اولاد میں یوں تو اور بھی کئی اہل علم ہوئے لیکن جو شہرت حضرت مولانا ضیاء الدین مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوئی وہ انہیں کا حصہ ہیں۔ آپ امام احمد رضا بریلوی کے خلیفہ تھے اور ۸۰ سال کے قریب مدینہ منورہ میں رہ کر فکر رضا کی ترویج و اشاعت میں مصروف رہے آپ کے روحانی مقام و مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ''قطب مدینہ'' تھے حضرت امام نورانی کی زوجہ محترمہ انہی قطب مدینہ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا مفتی

فضل الرحمٰن مدنی کی بیٹی ہیں۔ آپ نے ہر آڑے وقت میں امام نورانی کا بھرپور ساتھ دیا اور اُن کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو حضرت امام نورانی کی کامیابی کے پیچھے بھی ضرور آپ کی خوش بخت اور نیک سیرت زوجہ محترمہ کا ہاتھ ہے۔

امام نورانی کے چھوٹے بیٹے اویس نورانی امریکہ میں ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

بڑے فرزند حضرت علامہ صاجزادہ حافظ محمد انس نورانی صدیقی ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں جو قوتِ ارادی، بے ساختہ پن اور عاجزی وانکساری ان میں دیکھی گئی ہے وہ ہماری نوجوان نسل میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں جب وہ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کر چکے تو ماہِ رمضان میں امام نورانی نے انہیں بعض وظائف اور روحانی اشغال کے لئے کراچی کے انتہائی مغربی علاقے اورنگی ٹاؤن (جس سے آگے بلوچستان شروع ہو جاتا ہے) میں بھیج رکھا تھا وہ صرف نماز باجماعت کے لئے باہر نکلتے اور باقی اوقات میں گوشہ نشین رہ کر سلسلہ عالیہ قادریہ رضویہ علیمیہ کے معمولات میں مصروف رہتے۔ راقم ایک دن اس علاقے سے گزر رہا تھا کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا اور راقم نے جامع مسجد سلمان فارسی میں عصر کی نماز پڑھی جب صف بندی ہو رہی تھی تو پہلی صف میں "انس نورانی" کو دیکھ کر بڑا متعجب ہوا کہ انس میاں یہاں کہاں! بہر حال نماز ہو چکی تو میں بڑھ کر انس میاں سے ملا حال احوال معلوم کئے اور اپنی حیرانی سے انہیں آگاہ کیا تو حسب عادت مسکراتے ہوئے بولے کہ میں آج کل یہیں گوشہ نشین ہوں والد صاحب نے پورا ماہ رمضان یہاں گزارنے کو کہا ہے اور کچھ وظائف خاص طور پر "حزب البحر" پڑھ رہا ہوں۔

میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا کہ غریب خانہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ہی واقع ہے۔ زہے نصیب اگر ایک روزہ ہمارے ہاں افطار فرمالیں تو ہمارے لئے یہ سعادت ہوگی۔ پہلے تو انس میاں ٹالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن پھر ایک شرط پر مان گئے کہ نہ اشتہار بازی ہوگی نہ نعرے لگیں گے اور صرف روزہ کھول کر واپس آجاؤں گا میرے کھانے اور تراویح کے معمول میں

کوئی فرق نہیں آنا چاہئے۔ میں نے قبول کر لیا۔

غالباً دوسرے یا تیسرے روز اہتمام کیا اور انس میاں کو اطلاع کر دی گئی۔ انہیں لینے کے لئے میں چند منٹ تاخیر سے پہنچا تو وجہ دریافت کی میں کہا یہاں ٹرانسپورٹ کا ذرا مسئلہ رہتا ہے گاڑی کی بکنگ میں ذرا دیر لگ گئی۔ گاڑی کا سنتے ہی بولے "ارے صلاح الدین بھائی آپ نے سپیشل گاڑی کیوں لی یہاں سے کسی بھی بس میں بیٹھ کر چلے جاتے آپ نے خواہ مخواہ اتنا تکلف کیا"۔

خیر گاڑی میں بیٹھے اور غریب خانے پر آ گئے۔ عصر کے بعد تقریب شروع ہوئی تلاوت نعت کے بعد آپ نے خطاب فرمایا اور صرف **لعلکم تتقون** پر تقریباً پون گھنٹہ بہترین مدلل اور پر مغز گفتگو سے سامعین کو خوب محظوظ کیا پھر آپ ہی سلام بھی پڑھا اور دعا بھی کی۔

میرے محسن اور امام نورانی کے شیدائی عالم باعمل حضرت مولانا محمد عبداللہ قادری دامت برکاتہم العالیہ نے دعا کے دوران انس میاں سے کہا کہ "دعا کریں اللہ تعالیٰ مولانا صلاح الدین سعیدی کو فرزند عطا فرمائے"۔ تو آپ نے خصوصی دعا فرمائی اور اس دعا کی برکت سے مولا کریم نے اسی سال راقم کو بیٹا عطا فرمایا جس کا نام "احمد رضا" ہے اور ماشاء اللہ اب سال میں ہے۔

انس میاں کو ۸۸۔۹۰ اور ۹۳ کے انتخابات میں امام نورانی کی انتخابی مہم میں اور دیگر مواقع پر بھی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا الحمد للہ وہ اپنے والد اور دادا کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اُس وقت "انس میاں" اتنی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آج تو **نورٌ علیٰ نور** ہوں گے اور امام نورانی کے منصب پر آنے والے کو **نورعلیٰ نور** ہی ہونا چاہئے۔

حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

بھارتی صوبہ اتر پردیش کے ضلع مراد آباد میں ''سنبھل'' ایک چھوٹا سا مگر قدیم شہر ہے۔ اس شہر کا ذکر آشوک 5000 قبل مسیح میں بھی ملتا ہے۔ یہ راج کا دارالحکومت تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں سید سالار مسعود غازی نے اسے فتح کیا تو اس کے چوک ''دیپا سرائے'' میں علم نصب کیا اور اپنے ترک سپاہیوں کو وہیں آباد کیا۔ انہیں ترک خاندانوں میں سے ایک خاندان میں آگے چل کر ایک پابند شرع اور اچھی شہرت رکھنے والے فرد ملا تفضل حسین کے ہاں حضرت مفتی محمد حسین نعیمی 6 مارچ 1923ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں سایہ مادری سے محروم ہوگئے اور بڑی بہن فاطمہ اور بہنوئی حضرت مفتی محمد یونس نعیمی (جو صدر الافاضل کے شاگرد رشید اور جامعہ نعیمیہ مراد آباد کے مدرس تھے) نے آپ کی تعلیم وتربیت فرمائی۔

ابتدائی کتابیں اپنے بہنوئی صاحب سے پڑھنے کے بعد مفتی محمد حسین نعیمی جن اساتذہ سے پڑھے ان میں تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے سسر مفتی اجمل شاہ سنبھلی نعیمی رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت کے بڑے بھائی مفتی امین الدین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ، اور صدر الافاضل حضرت سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ممتاز ہیں۔ منطق کی مشہور کتابیں ''قاضی'' اور ''حمد اللہ'' فلسفہ کی ''صدرہ'' اور ''شمس بازغہ'' علم الکلام کی ''شرح عقائد'' اور ''خیالی'' حدیث کی کتاب بخاری اور تفسیر بیضاوی خود صدر الافاضل سے پڑھیں۔

مفتی محمد حسین نعیمی بچپن ہی سے بلا کے ذہین تھے۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں تمام ساتھیوں کی نسبت اپنے اساتذہ سے سب سے زیادہ سوالات کیا کرتا تھا ایک مرتبہ فلسفہ کی ایک کتاب زیر مطالعہ تھی اور خود صدر الافاضل پڑھا رہے تھے۔ میں نے ایسے انداز میں سوال کئے

کہ حضرت مزاحاً فرمانے لگے ''محمد حسین تم مولوی کیوں بنے؟ تم کو تو تھانے دار بننا چاہئے تھا''۔

1942ء میں صدر الافاضل کے شاگرد رشید اور پیر بھائی حضرت سید ابوالبرکات احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے حزب الاحناف کے لئے ایک مدرس طلب فرمایا تو حضرت صدر الافاضل نے اپنے نوجوان شاگرد 19 سالہ مفتی محمد حسین نعیمی کی صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو حزب الاحناف میں پڑھانے کے لئے روانہ فرمایا۔

مفتی صاحب خود فرماتے ہیں کہ جب میں جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے فارغ ہوا تو سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر قبلہ صدر الافاضل نے جامعہ حزب الاحناف لاہور میں بطور مدرس میرا انتخاب فرمایا اور تدریس کے لئے مجھے بھیج دیا اور حزب الاحناف میں میری تدریس کا آغاز ہوا۔ سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ نے میرا ماہانہ وظیفہ 15 روپے مقرر فرمایا اور قبلہ سید صاحب نے مجھے مختصر المعانی، ہدایہ اور جلالین وغیرہ پڑھانے کو دیں۔ چنانچہ میں جب پڑھاتا تو سید صاحب چھپ کر میرے طرز تدریس اور انداز تقریر کو سنتے جس کا مجھے کوئی علم نہ ہوتا جب مہینہ گزر گیا تو سید صاحب نے طے شدہ 15 روپے کی بجائے دس روپے بڑھا کر 25 روپے دیئے تو میرے پوچھنے پر آپ نے بتایا کہ میں آپ کے درس کو چھپ کر سنتا رہا ہوں۔ آپ کو بہترین مدرس پایا تو میں نے خوش ہو کر آپ کے وظیفہ میں اضافہ کر دیا۔

مفتی محمد حسین نعیمی نے 42 سے 48 تک حزب الاحناف کی مسند تدریس پر علم وفن کے موتی لٹائے اور لاہور کے علمی اور تدریسی حلقوں میں اپنا لوہا منوالیا۔

1948ء سے تحریک ختم نبوت تک آپ لاہور کی تاریخی درسگاہ دار العلوم نعمانیہ میں بھی پڑھاتے رہے مگر تحریک ختم نبوت میں حصہ لینے کے ''جرم'' کی پاداش میں ''خداوندان نعمانیہ'' نے آپ کو نعمانیہ سے فارغ کر دیا۔

یہ آپ کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ یہیں سے آپ اعلیٰ پائے کے مدرس کے ساتھ مرد میدان بھی ثابت ہوئے اور آپ نے تحریک ختم نبوت میں بے مثال کردار ادا کر کے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا اور تحریک ختم نبوت ہی کی برکت سے آپ گوشہ گمنامی سے نکل کر

پاکستان کے افق پر ایسے چمکے کہ پاکستان میں دینی اور سیاسی تاریخ کی ایک اہم شخصیت بن گئے۔ بعدازاں آپ دیگر تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اور ساتھ ہی آپ نے ایک بہت بڑے تعلیمی اور تعمیراتی پروجیکٹ ''جامعہ نعیمیہ لاہور'' پر شاندار کامیابی سے کام کیا۔ اور بڑے سلیقے اور مہارت سے تعمیرات اور تعلیمات دونوں شعبوں میں شبانہ روز محنت کر کے شاندار کامیابی حاصل کی اور مدارس دینیہ کے ذمہ دار حضرات کے لئے قابل تقلید عملی نمونے چھوڑے۔

بھٹو دور تک آپ اپوزیشن کی سیاست کرتے رہے۔ لیکن ضیاء دور سے آپ نے اپنے رویہ میں واضح تبدیلی پیدا کی اور غالباً اسلام کے نام پر دھوکہ کھا کر ضیاء اور نواز شریف کا بھرپور ساتھ دیتے رہے لیکن اسلام کا نفاذ ایسے حکمرانوں سے کہاں متوقع ہے جو امریکہ کی مرضی سے تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور اسی کے اشارۂ ابرو سے ''ملک بدر'' یا ''دنیا بدر'' ہو جاتے ہیں۔

الغرض مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نفاذ اسلام کا خواب اپنی آنکھوں میں سجائے 12 مارچ 1998ء کو ہم اسلامیان پاکستان کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بہشت سدھار گئے۔

فکر رضا کا ایک پرجوش مبلغ

خطۂ لاہور میں فکر رضا کے اوّلین معماروں میں پروفیسر حاکم علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ، مفتی غلام جان ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعجاز ولی رضوی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ سیّد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دونوں فرزند ابوالحسنات سیّد محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ابوالبرکات سیّد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے نام درخشندہ ترین ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے عشروں میں مولانا سیّد ایوب علی رضوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی رضویت اور رضویات کے حوالے سے روشن ہے مگر عوامی سطح پر قریہ قریہ نگر نگر جس طرح حضرت مولانا الٰہی بخش قادری ضیائی رحمۃ اللہ علیہ نے اعلیٰ حضرت کے پیغام عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عام کیا یہ انہی کا حصہ تھا۔

مولانا الٰہی بخش ضیائی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۳۳ء میں حکیم محمد شفیع کے ہاں ایک قدیم لاہوری خاندان میں پیدا ہوئے ابتدائی کتب حضرت مولانا سیّد منور علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد عالم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور دورہ حدیث حضرت علامہ سیّد ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ سے کیا اور سیّد صاحب کے حکم پر ہی خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے استاد محترم کی دعاؤں کے طفیل مولانا کو ملک گیر شہرت عطا فرمائی۔

۶۰ کے عشرے میں آپ نے خطابت کا آغاز کیا اور ساتھ ہی محکمہ ڈاک میں سروس شروع کی لیکن آہستہ آہستہ تبلیغ اسلام کا جذبہ غالب آتا گیا اور آپ نے سروس کی پابندی سے گلوخلاصی پا کر ہمہ وقت دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ڈنکے بجانا شروع کر دیئے اور محبت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں سرشار ہو کر عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نغمات سے مسلمانوں کے سینے آباد کرنا شروع کر دیئے۔

۷۰ کا عشرہ آپ کے عروج کا عشرہ تھا ملک بھر کے بڑے جلسوں میں آپ کی شرکت ہی جلسوں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جانے لگی۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں ہونے والی یوم رضا کی سالانہ نشستوں میں آپ نے بیشمار خطابات فرماتے اور اسکے علاوہ اعلیٰ حضرت کے عرس کی مختلف تقاریب میں آپ خاص طور پر شرکت فرماتے تھے۔

۷۹ء میں آپ حج وزیارت کو گئے تو قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین مدنی کے مرید ہو گئے اور اسی نشست میں حضرت قطب مدینہ نے آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ رضویہ میں خلافت اور اجازت عطا فرمائی۔ جب تک قطب مدینہ زندہ رہے مولانا ضیائی صاحب اکثر و بیشتر آقا کی بارگاہ میں حاضر ہوتے رہتے جب بھی مولانا حاضر خدمت ہوتے۔ حضرت قطب مدینہ اپنی رہائش گاہ پر آپ کا خطاب ضرور کراتے اور مولانا کو ڈھیروں دعاؤں اور باطنی فیض سے نوازتے۔ یہ سلسلہ حضرت قطب مدینہ کے بعد بھی جاری رہا اور قطب مدینہ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی مولانا ضیائی کو اس طرح نوازتے رہے جس طرح اپنے عظیم والد ماجد کو دیکھا اور ان سے سیکھا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا الٰہی بخش ضیائی نے بھی حضرت قطب مدینہ کے سارے خانوادے سے عقیدت و محبت کی مثال قائم فرمائی اور ہمیشہ قطب مدینہ کے گن گاتے رہے۔

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی آپ نے اپنے انداز خطابت سے اہلسنت کی محافل کو خوب گرمایا اور امام احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ علامہ سیّد محمود احمد رضوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء اہلسنت کے ساتھ دن رات محنت کی۔ آپکی آخری کتاب ''حسن یوسف'' کے مقدمہ میں محترم فاروق احمد قادری رقم طراز ہیں۔ غزالی زماں مولانا سیّد احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے واعظ کو بڑی محبت سے سماعت فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے''۔

مولانا الٰہی بخش قادری ضیائی رحمۃ اللہ علیہ مسلک حقہ اہلسنت کے بے باک سپاہی تھے اور مذہب اہلسنت کی حقانیت کے بارے میں حق الیقین کی منزل پر تھے۔ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی روایت کرتے ہیں کہ وصال سے کچھ عرصہ قبل میانی صاحب قبرستان میں خلیفہ اعلیٰ حضرت مفتی غلام جان ہزاروی کے مزار مبارک پر تقریر کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے ارشاد فرمایا لوگو! میرا چہرہ دیکھ لو اور مرنے کے بعد بھی دیکھ لینا اگر اسی طرح ہو تو سمجھ لینا میں بھی سچا ہوں میرا مذہب بھی سچا ہے'' واقعی بعد از مرگ ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور ہزاروں لوگوں نے باقاعدہ قطار بنا کر عاشق رسول کے چہرے کی زیارت کی۔

تحریک پیام مصطفیٰ ﷺ کے چیئرمین حضرت علامہ پروفیسر ڈاکٹر پیر عبدالرؤف

قریشی نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند فرمائے۔

پیر طریقت حضرت علامہ الٰہی بخش قادری ضیائی رحمۃ اللہ علیہ چندان نفوس قدسیہ میں سے ہیں کہ جن کے کائنات سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی بندہ ان کو اپنے درمیان ہمیشہ محسوس کرتا ہے حضرت علامہ الٰہی بخش قادری ضیائی رحمۃ اللہ علیہ سے میرا تعلق اس وقت سے تھا کہ جب میں مختلف کالجز میں حصول علم کی خاطر محو سفر تھا مگر ایک علمی اور مذہبی خاندان سے تعلق کی بنا پر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت سے ایک فطری لگاؤ تھا اور بحمدہ تعالیٰ ایک عرصہ دراز تک میں ان کی شاہ عالمی کی معروف مسجد میں باقاعدگی سے ہر جمعہ ان کا خطاب سننے جاتا اور پھر پورا ہفتہ اس خطاب کی سرشاری میں خود کو مسرور و محظوظ کرتا رہتا۔

حضرت علامہ الٰہی بخش قادری ضیائی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ مسلک رضا کے سچے پاسبان تھے اور جب وہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے اشعار ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے تو قلب و جگر حضور ﷺ کے عشق کی لذت سے سرشار ہو جاتے۔ انکا ترنم بھی منفرد تھا اور ان کا جوش و ولولہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں بیک وقت شعلہ بھی تھے اور شبنم بھی۔ دشمنان مصطفیٰ اور گستاخان مصطفیٰ کیلئے وہ ایک شعلہ ہی نہیں بلکہ پورے کے پورے آتش فشاں تھے اور محبت مصطفیٰ کے حوالے سے وہ شبنم افشاں تھے۔ انہوں نے زندگی بھر کسی غیر مقلد یا بدعقیدہ سے ہاتھ ملانا تو کیا ان سے بات کرنا بھی گوارا نہ کی اور نہ ہی کسی دنیادار کی کاسہ لیسی کی وہ ہر وقت اپنے خطابات میں اعلیٰ حضرت کے یہ شعر بڑی خصوصیت سے پڑھتے کہ

کہ کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

حضرت علامہ الٰہی بخش قادری ضیائی رحمۃ اللہ علیہ ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک رواں دواں تحریک اور فکر کا نام تھا ایسی نابغۂ روزگار شخصیات صدیوں بعد اس زمانے میں آتی ہے دعا ہے کہ پروردگار عالم انہیں اعلیٰ جنتوں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

چوتھا باب

عہدِ حاضر کی شخصیات

حضرت علامہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی مدظلہ العالی

حضرت پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب سے شناسائی ۱۹۹۲ء میں اس وقت ہوئی جب فاروقی صاحب کی زیرِ ادارت و انصرام لاہور سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''جہانِ رضا'' نظر سے گزرا، کراچی میں استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کی بدولت مجھے ''جہانِ رضا'' عطا ہوا۔ اولین فرصت میں ماہنامہ ''جہانِ رضا'' کا سنجیدگی سے مطالع کیا۔ اداریے اور مضامین کے حسن انتخاب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کوئی مضمون بھرتی کا نہ تھا بلکہ تازگی اور تحقیق کا ہر مضمون شاہکار تھا۔ صحافت میں اداریہ نویسی ایک سنجیدہ اور خشک صنف ہے لیکن فاروقی صاحب کے اسلوبِ تحریر نے سنجیدگی کو شگفتگی اور خشکی کو تازگی میں اس طرح ڈھالا کہ قارئین کی دلچسپی نہ صرف آخری سطر تک قائم رہتی بلکہ قارئین کے ذوق وشوق کی آسودگی کے ساتھ ساتھ فاروقی صاحب کا پیغام بھی ان کے ذہن نشین ہوتا گیا۔ مختصر یہ کہ ''جہانِ رضا'' فاروقی صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اولین نقش تھا جو میری لوحِ دماغ پر ثبت ہوا اور گلشنِ رضا کا ایک جھونکا تھا جس سے دل وجاں وجد کرنے لگے۔

جب میں ۱۹۹۵ء میں کراچی سے واپس لاہور آیا تو فاروقی صاحب سے ملنے کی شدید خواہش ساتھ لایا۔ لاہور میں کچھ دن ماہنامہ ''فیضان مدینہ'' کی تیاری اور اشاعت وترسیل میں گزر گئے۔ بالآخر فاروقی صاحب سے ملاقات اور ''فیضان مدینہ'' اُن کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے آپ کی محفل (مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ) میں پہنچا، آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے شرف ملاقات نہ ہوا لیکن مکتبہ نبویہ میں آپ کی تصانیف وتراجم اور مرتب کردہ کتابوں کے گلہائے رنگ رنگ کو دیکھنے اور سرسری مطالعہ کا موقع میسر آ گیا۔ آپ کا مرتب کردہ ''تذکرہ علمائے اہل سنت و جماعت'' دیکھا تو تاریخ وتذکرہ کی اصناف میں بھی آپ کا لوہا ماننا پڑا، تاریخ وتذکرہ میں آپ کی

کتابیں سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ''تفسیر نبوی'' پنجابی کا اردو ترجمہ جو پندرہ خوبصورت جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر فارسی اور عربی کتابوں کے اردو تراجم دیکھے تو آپ میدانِ ترجمہ کے بھی شہسوار نظر آئے۔ دیباچہ اور مقدمہ نگاری میں مخصوص رنگ و آہنگ، سیرت و خاکہ نگاری میں فنکارانہ مہارت، تنقید و تبصرہ میں بے باکانہ گرفت اور شوخیٔ تحریر دیدہ و دل کو منور کرتی گئی اور آپ کی شخصیت کا سحر گہرا ہوتا گیا۔

چند روز بعد ''مکتبہ نبویہ'' پھر حاضر ہوا تو فاروقی صاحب کو جلوہ افروز پایا۔ آپ انتہائی شفقت و مروت سے پیش آئے، ایک طویل ملاقات کا شرف بخشا، آج تک اُن کی شفقت بھری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے اور انہوں نے مجھے اپنے دامنِ محبت سے آزاد کیا اور نہ میرے دل نے رہائی کا مطالبہ کیا۔

کراچی میں قیام کے دوران پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کی صحبت میں جو پاکیزہ ادبی ذوق پایا تھا لاہور میں فاروقی صاحب کی تربیت نے اسے مزید جلا بخشی۔ میرا مضمون ''کلام رضا میں صنعتِ تضاد کا مختصر مطالعہ'' جب ماہنامہ ''جہانِ رضا'' میں چھپا تو فاروقی صاحب کی مزید توجہ حاصل ہوئی پھر ایک وقت آیا کہ آپ نے مجھے رئیس التحریر علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ پر ایک مختصر مضمون لکھنے کا حکم فرمایا۔ ایک طرف تو علامہ ارشد القادری کی جلیل القدر ہستی موضوعِ سخن اور دوسری طرف فاروقی صاحب جیسے عظیم دانشور کی فرمائش، بہر حال توقعات پر پورا اُترنے کی سعی کی اور استطاعت کے مطابق مضمون تیار کر کے فاروقی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے پسند فرمایا اور ''جہانِ رضا'' اگست ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔ فاروقی صاحب کی شفقتوں کے سائے وقت کے ساتھ ساتھ مزید گھنے ہوتے چلے گئے۔

''جہانِ رضا'' میں ایک مستقل علمی مضمون ''یسئلون'' قارئین میں بہت مقبول تھا جسے فاروقی صاحب خود تحریر فرمایا کرتے تھے، عدیم الفرصتی کے باعث آپ نے ''یسئلون'' کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا اور اس مشکل کام کی ذمہ داری چند ماہ کے لئے مجھے

سونپ دی۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں اس امتحان اور فاروقی صاحب کے اعتماد پر پورا اترا۔ اس دوران آپ کی رسمی و غیر رسمی ہر طرح کی مجلس میں کثرت سے شرکت کے مواقع ملے۔ آپ کی خدمت میں حاضر باش رہنے سے نہ صرف میرے علم و قلم کو توانائی ملی بلکہ اعتماد کا عنصر بھی ارتقاء پذیر ہوتا چلا گیا۔

دینی و مذہبی، علمی و قلمی، سیاسی و سماجی، فکری و نظریاتی اور سرکاری اور درباری شخصیات سے بھی آپ کے تعلقات کا حلقہ سجا رہتا۔ ان سب باکمال ہستیوں میں سے چند ایک کے ساتھ آپ کا بہت گہرا تعلق ہے اور ان بے نظیر و بے تکلف دوستوں کا آپ کے پاس اکثر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میری خوش بختی ہے کہ مجھے ان مستقل مزاج ثقہ افراد سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اگر ان لوگوں کی شخصیت و فن پر لکھا جائے تو ہر ایک کے لئے الگ الگ کتاب مرتب ہو سکتی ہے

تیری محفل میں بیٹھنے والے
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

ان بے نظیر آدمیوں میں سے فی الحال میں اُس شخصیت کا ذکر کرتا ہوں جو نہ صرف محترم فاروقی صاحب کے مخلص، مزاج شناس اور بے بدل دوست ہیں بلکہ سفر و حضر، خوشی و غم اور راز و نیاز میں بھی باہم شریک رہتے ہیں، فاروقی صاحب کے مصاحبین و معاونین میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، یہ شخصیت حضرت عبداللہ المعروف شیخ ہندی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ و جانشین حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ کے فرزند ارجمند، عجز و انکسار کی تصویر، عرفان گنج بخش کے سفیر حضرت میاں محمد سلیم حماد ہجویری کی ہے جس نے مجھے اس زاویہ سے بہت متاثر کیا ہے کہ آپ صاحب مطالعہ بھی ہیں اور صاحب قلم بھی، علمی و ادبی شخصیات اور اُن کے شہ پاروں کی نہ صرف تعریف و توصیف کرتے ہیں بلکہ ایک بالغ نظر نقاد کے طور پر مستحکم رائے بھی رکھتے ہیں اور مناسب موقع پر اظہار کے خوبصورت پیرائے میں نقد و تبصرہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ آپ نہ صرف علم دوست ہیں بلکہ صاحبانِ علم و فن کے سچے قدردان بھی ہیں چونکہ آپ فاروقی صاحب کی ذات اور صفات سے

بخوبی واقف ہیں اس لئے اپنی محافل میں آپ اکثر اس بات کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ

''فاروقی صاحب کے شہ پاروں کی جمع وتدوین ہونی چاہئے۔ان کے زرخیز دماغ میں ۷۸ سالہ زندگی کے مشاہدات وتجربات اور مطالعہ کی وہ روشنی ہے جس میں عالم اسلام اور پاکستان کی تاریخ کا ہر پہلو درست صورت میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے لہٰذا آپ کی یاداشتوں کے دریچوں سے اس روشنی کو عام کرنے کی مزید ضرورت ہے۔اس کیلئے فاروقی صاحب کی شخصیت وفن پر قلم وکلام سے ان کے شایان شان مبسوط کام، حوصلہ افزائی اور کشادہ دلی سے تعاون ہونا چاہئے۔اس سلسلہ میں اہل علم خصوصاً آپ کے حلقہ احباب کو سنجیدہ اور مقدور بھر کوشش کرنا چاہئے۔میں نے کہا جناب پروفیسر مسعود احمد صاحب پر بھارت میں پی ایچ ڈی کا مقالہ، جناب ابوالطاہر فدا حسین فدا صاحب پر ایم فل کا مقالہ اُن کی حیات میں ہی لکھا جاچکا ہے۔اسی طرح پرائیویٹ سیکٹر میں مولانا عبدالحکیم شرف قادری، صاحبزادہ سید محمد فاروق القادری صاحبان اور چند دیگر بزرگوں پر کام ہو رہا ہے اور یہ ایک اچھی روایت ہے''۔کیونکہ میں خود ہی بارش کا پہلا قطرہ ہوں۔

جب فاروقی صاحب کو اس کام سے آگاہ کرنے اور سرپرائز دینے کا وقت آیا تو یہ خیال ستانے لگا کہ نہ جانے میرے اس کاوش پر ان کا ردعمل کیا ہوگا بہرحال امید وبیم کی اس کیفیت میں مبتلا عیدالفطر ۱۴۲۶ھ کے روز آپ کی قیام گاہ ریواز گارڈن پہنچا، معانقہ کے بعد جب ان کی خدمت میں انہی کے شہ پاروں کو یکجا صورت میں پیش کیا۔اس کام کی قدر کرتے ہوئے مجھے اپنے دست شفقت سے تھپکی اور زبان محبت سے داد وشاباش دی اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں وہ خاص چمک تھی جو ''جنس نایاب'' نہیں تو ''جنس کمیاب'' ضرور ہے۔

آخر جون 2006ء میں یہ کتاب ''باتوں سے خوشبو آئے'' کے نام سے چھپی

چند! اقتباسات ملاحظہ فرمائیں

منگولوں کے لشکروں کے ہاتھوں ہونے والے ایک تاریخی المیہ کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

''روس کے علاقے صحرائے گوبی سے ایک ایسا طوفان اُٹھا جس نے اس وقت کی ''سپر پاور'' اسلامی سلطنتوں کو تہہ وبالا کردیا۔منگولوں کے لشکر صحرائے گوبی کے سردار اور طوفانی علاقوں سے نکل کر چنگیز خاں کی قیادت میں سلطنتوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھے اور سلام کی تہذیبی وتمدنی تاریخ کو یکسر بدل کر رکھ دیا''۔

حضرت باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانی کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

''مغل دور میں اگرچہ بے شمار نقشبندی مشائخ پاک وہند میں آئے مگر جس ہستی نے نہایت اہم کردار ادا کیا اس کا اسم گرامی حضرت خواجہ باقی باللہ ہے وہ افغانستان کے دارالخلافہ کابل سے نکل کر ہندوستان آئے اور حضرت مجدد الف ثانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایسی تربیت کی کہ جس کے اثرات چاردانگ عالم تک پہنچے حضرت مجدد الف ثانی نے ایک طرف روس کے شمالی خطوں سے لے کر ترک وتاتار تک سلسلہ نقشبندیہ کی روشنی پھیلائی اور برصغیر کو کفر والحاد سے پاک کیا''۔

برصغیر میں عیسائی مشنریز کا ابتدائی حال پڑھئے اور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کی تاریخ نویسی کا منفرد انداز ملاحظہ کیجئے۔

''برصغیر میں فرنگی اقتدار کے طلوع کے ساتھ ہی عیسائی مشنریز کی آمد کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط پر 1813ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ''انجمن ترقی علوم عیسائیت'' کے

آرک بشپ کو اختیار دیا گیا کہ وہ برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ عیسائیت کے لئے اپنے مبلغین بھیجے۔ چنانچہ انگلینڈ کے پادریوں کی ایک جماعت 1814ء میں کلکتہ پہنچی اور اپنا تسلط قائم کرتی گئی انگلستان کے مشہور عیسائی مبلغین نے برصغیر میں عیسائی تبلیغ کی بنیاد رکھی جن میں ہنری مارٹن، کلاڈلیس، لوکا ئین، ڈاکٹر ڈف، مسٹر جن سن، پادری جوشا مارش اور ولیم وارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں"۔

فاروقی صاحب کی علمی جلالت کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

"لفظ" محراب" حرب سے نکلا ہے عربوں کی جاہلی جنگوں میں میدان جنگ میں ایک مخصوص جگہ ہوتی تھی جہاں سالار جنگ کھڑا ہو کر سپاہیوں کو ہدایت دیتا تھا۔ اس مقام کا نام محراب تھا یعنی" جنگ کرنے کی جگہ" جب اسلام کی روشنیاں آئیں تو اس لفظ کو میدان جنگ سے اٹھا کر مسجد میں لا رکھا، مسجد میں" محراب" کو مستقل جگہ دی گئی پھر اس جگہ پر سالار جنگ کی بجائے خطیب مسجد یا امام مسجد کو مقرر کیا گیا تا کہ وہ باطل قوتوں اور شیطانی حملوں کے خلاف اپنے سامعین کو آگاہ کرتا رہے۔ ہر مسجد میں" محراب" میں ایسا مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر ہمارے خطیب عوام کو نفس و شیطان کی فریب کاریوں سے آگاہ کرتے ہیں"۔

تربیت کا ایک دل نشین انداز دیکھئے۔

"ہم علمائے اہل سنت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ روایتی انداز سے بالاتر ہو کر تندہی سے افکار رضا کو عوام تک پہنچانے میں حصہ لیں آئمہ کرام مساجد میں کنزالایمان کی روشنی میں درس قرآن کے حلقے قائم کریں، نعت خواں حضرات "حدائق بخشش" سے نعتوں کا انتخاب کر کے صحیح تلفظ اور باوقار انداز میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں ہدیہ تکریم کریں، مقرر حضرات اعلیٰحضرت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد لوگوں سے خطاب کریں، دینی جرائد و رسائل کے مدیران گرامی ہر شمارے میں اعلیٰ حضرت کی علمی و فقہی خدمات پر کم از کم مضمون ضرور شائع

کریں، اساتذہ کرام" جہان رضا" کے مطالعہ کے لئے اپنے حلقہ اثر کو آمادہ کریں، مفتیان کرام فتویٰ دینے سے پہلے فتاویٰ رضویہ سے مدد حاصل کریں، مدرس حضرات اپنے طلباء کو اعلیٰ حضرت کی شخصیت سے آگاہ کرتے رہا کریں، اس طرح افکار رضا کو ایک ایسا قافلہ تیار ہوگا جس کا رُخ سوئے مدینہ ہوگا اور ہر فرد پکار اُٹھے گا

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا"

ذکر رسول کی نورانی محافل کی منظر کشی کا منفرد پیرایہ اظہار دیکھتے جایئے۔

"آج پاکستان کے گوشے گوشے میں نعت کی محفلیں اور مدحت رسول کی مجالس بجتی ہیں نعت خواں اپنی سج دھج سے مدحت سرا ہوتے ہیں، دوسری طرف سامعین بھی عاشقان رسول کی شکل میں پروانہ وار حاضر ہوتے ہیں بلکہ ساری ساری رات ذوق و شوق کا اظہار کرتے ہیں محبت رسول میں سرشار رہتے ہیں۔ نعت خوانوں پر انعامات کی بارش ہوتی ہے۔ انکے احترام میں آنکھیں فرش راہ کی جاتی ہیں ان کی خوش آوازی پر گوش ہوش کے دامن پھیلا دیئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تنزل الملائکۃ والروح کا سماں بندھ گیا ہو"۔

ملک کے معروف نعت خواں محمد اعظم چشتی مرحوم کا ذکر خیر کرتے ہوئے یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"اعظم چشتی بڑے نفیس ذوق کے مالک تھے کوئی بے سرا نعت خواں یا غلط تلفظ ادا کرنے والا نعت پڑھتا اور اپنے کلام کی لافیں مارتا تو کبیدہ خاطر ہو جاتے اور کہتے۔

اعظم ہمارے ہاتھ سے پیانہ گر گیا
ہر بوالہوس کے ہاتھ میں پیانہ دیکھ کر"

صائم چشتی کی ایک ادبی نشست کا حال سنئے اور سر دھنئے۔

''بیمار اور مریل شاعر، بدمزہ اور بے تکے شاعر، زندگی کی سرحدوں سے چند قدم پر رُک جانے والے شاعر صائم چشتی کی مجلسوں میں پہنچ کر جب دادِ سخن پاتے تو مانی و بہزاد کو غرور کی نظروں سے دیکھنے لگتے''۔

ایک کاتب کی کتابت:

''ایک سال بعد وہ کتابت کر کے لائے۔ بل وصول کر کے ابھی چائے پی رہے تھے کہ میں نے کتابت پر نگاہ ڈالی تو الفاظ ایسے ''باغ و بہار'' دکھائی دیئے کہ دل چاہا کتابت اُن کے منہ پر دے ماروں۔ لیکن اُن کی بیروزگاری کی تصویر سامنے آئی اور اپنی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ اٹھا ایک دیا سلائی لے کر کتابت اُن کے سامنے جلا ڈالی۔ وہ مجھے ذہنی مریض سمجھ کر چپ سادھے بیٹھے رہے اور اپنی قلم کے کمالات کی داد وصول ہوتے دیکھتے رہے۔ اس دن سے اُن کی شکل اور اُن کے قلم کے ''جواہر آبدار'' کی زیارت کو ترس گیا ہوں۔ کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں''

اپنے ایک دوست شیخ بشیر عرف لیڈر کی قلمی تصویر کس خوبی سے اُتاری ہے۔

''لیڈر صبح کے وقت موٹے شیشوں کی عینک سے ملک کے سارے اخباروں کا مطالعہ کرتا۔ دنیا بھر کے مشہور سیاستدانوں کے نام ناصحانہ خطوط لکھتا اور انہیں مفید مشورے دیتا دوستوں کے لئے بار بار چائے منگواتا۔ اگر مرزا غلام قادر صاحب قدرے چپ چپ دکھائی دیتے تو ''جالندھر موتی چور'' سے مٹھائی منگواتا۔ لیڈر کے ہاں اُلٹے پلٹے الفاظ اور عجیب و غریب تلفظ سن کر ہم اس کا منہ تکنے لگتے تو اپنے لڑکے کو آواز دیتا ''بھئی دوستوں کے لئے چائے لاؤ'' لیڈر کثیر اولاد کا باپ ہوتے ہوئے بھی غریب مولویوں، نادار طالب علموں اور عمر رسیدہ شاعروں کو بڑی متانت کے ساتھ پہلی، دوسری، تیسری بلکہ چوتھی شادی کا مشورہ

دیتا۔ ''دُکاندار'' اور ''شیخ'' ہونے کے باوجود ہاتھ کا کھلا، زبان کا کھرا اور دل کا مخلص، آپ کو اس زمانہ میں دنیا بھر میں ایسا شخص کوئی نہیں ملے گا''

شاہی مسجد لاہور کے خطیب عبدالقادر آزاد کی آزادی کو کیسے جچے تلے لفظوں اور محاوروں میں اپنے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔

''وہ خوشامد درآمد کے فن کو خوب جانتے تھے جو حکومت آئی اس کی تعریف کی۔ اس کے گن گائے۔ بھٹو آئے تو بادشاہی مسجد کے منبر و محراب ''اسلامی سوشلزم'' کا گہوارہ تھے جنرل ضیاء الحق آئے تو ''عسکری نظام، نظام رحمت'' تھا۔ نواز شریف آئے تو (عبدالقادر آزاد) بے نظیر پر لعنت بھیجتے اور بے نظیر آئی تو اس کی جمہوریت کے لئے دعائیں کرتے۔ نواز شریف دوبارہ آئے تو آزاد بے نظیر پر تھوکتے بھی نہ تھے۔ مولانا آزاد کی یہ ''حکمت عملی'' بڑی کامیاب رہی۔ ہر آنے والے کا استقبال اور جانے والے پر لعنت''

حق مغفرت کرے عجب ''آزاد'' مرد تھا

اپنے دوست مولانا کوثر نیازی وفاقی وزیر مذہبی امور کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

''ہم ان دنوں کی بات کر رہے ہیں جب وہ شام نگر چوبرجی، لاہور میں رہتے تھے اور شاہ عالمی بازار کی لال مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے ''ماڈرن خطاب'' کیا کرتے تھے۔ ہم نے اُن کو مقطوع اللحیۃ تو نہیں دیکھا البتہ وہ ''مقصور اللحیۃ'' تھے اِن دنوں ہم خود بھی مقصور اللحیۃ تھے۔ بشیر حسین ناظم ''مفقود اللحیۃ'' تھے۔ قاری عطاء اللہ ''محروم اللحیۃ'' تھے۔ مولانا مسلم خطیب ہونے کے باوجود ''مقصور اللحیۃ'' تھے۔ امریکہ کی ایک یہودی خاتون ''مریم'' دامن اسلام میں آکر دینی تربیت پا رہی تھی۔ مولانا کوثر نیازی اس جواں سال خاتون سے بڑے متاثر تھے وہ ہر روز دیسی مرغی کے پانچ انڈے اُبالتے اور سائیکل پر سوار ہو کر لے جاتے اور نومسلم خاتون کو پیش کرتے یہ فعل بُرا نہیں تھا مگر ہمیں ''احساس محرومی''

اندر سے کاٹتا۔ بشیر حسین ناظم نے ایک دن مولانا مسلم صاحب کو کوثر نیازی کی اس ''حرکت'' سے آگاہ کیا۔ دوسرے دن مولانا مسلم فرمانے لگے کوثر نیازی تیری یہ حرکت کہ مریم کو پانچ پانچ انڈے اور ہمیں خالی چائے۔ مولانا کوثر نیازی فرمانے لگے حضرت وہ نومسلم ہے میں تو یہ خدمت ''تالیف القلوب'' کے لئے کرتا ہوں۔ مولانا مسلم فرمانے لگے وہ تو کل کی مسلمان ہے ہم صدیوں سے مسلمان چلے آرہے ہیں۔ مجلس کشت زعفران بن گئی اور اس کے بعد مولانا کوثر نیازی نے زندگی بھر ہمیں خالی چائے نہیں پلائی''۔

شورش کاشمیری کی یادوں میں ایک دلچسپ واقعہ:

''میں اور شورش تو کھڑے رہے مگر بشیر حسین ناظم نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ مولانا عبداللہ درخواستی کے قدموں پر سر رکھ کر ''سجدہ کناں'' بچوں کی طرح رونے لگا۔ مولانا درخواستی، ناظم کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے جیسے پالتو بلی کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے۔ نہ مولانا درخواستی نے انہیں اُٹھایا نہ کسی اور مولوی نے سمجھایا کہ (غیر اللہ) کو سجدہ نہ کرو۔ مولانا درخواستی نے تبرک دیا اور تعویذ دیا۔ باہر سڑک پر آکر ناظم نے کہا شورش! آپ کے اسلاف ایسے ہیں تبرک دیتے ہیں تعویذ بانٹتے ہیں سجدہ کراتے ہیں۔ شورش نے کہا ناظم دفع ہو جاؤ ہمارے اسلاف کے خلاف بکواس نہ کرو۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے''

مدنی سفرنامے میں ایک سعودی شہزادے کی ایک محفل نعت کا سماں یوں باندھتے ہیں۔

''الشیخ عادل الفہمی کی مجلس نعت وصلوٰۃ بڑے قاعدے طریقے سے قائم ہوتی ہے مجال ہے کوئی مطوع نجدی شرک و بدعات کی میلی آنکھ اُٹھا کر ادھر دیکھ جائے بلکہ میں نے کئی ''خبیث مطوعوں'' کو شریک دعوت خورد ونوش دیکھا جو شرک و

بدعت کے سارے فتوے الشیخ عادل الفہمی کے محل سے باہر ہی چھوڑ آئے تھے۔

پہلے جناب شیخ نے دیکھا ادھر اُدھر
پھر سر جھکا کے داخل میخانہ ہو گئے''

ایک جگہ محکمہ اوقاف پر برسنے کا انداز اور قلم کے جلال و جمال کا امتزاج ملاحظہ ہو۔

مساجد اور دربار محکمہ اوقاف کی تحویل میں دے دیئے گئے اب یہ بدقماش اور کرپٹ اہلکار وارثان محراب ومنبر کو اپنے دفتروں میں چکر لگواتے ہیں۔ کروڑوں کی آمدنی خود کھاتے ہیں غبن کرتے ہیں اللے تللوں میں اُڑاتے ہیں اور وارثان محراب ومنبر کو ''حقیر گریڈ'' دے کر احسان فرماتے ہیں۔ اب ظاہر ہے محراب ومنبر کا وارث جب محکمہ اوقاف کے کلرکوں کے رحم و کرم پر ہوگا تو وہ برائی کی قوتوں کو کیسے للکار سکے گا۔ اقبال سے معذرت کے ساتھ۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل ''محکمہ'' نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ''

مسجدوں کی ویرانی اور مرثیہ خوانی کا نقشہ کیسے پردرد الفاظ میں کھینچا ہے۔

''مساجد کو دیکھئے جن کے صحن میں محکمہ اوقاف کے کبوتر اُڑانیں بھرتے ہیں اور آئمہ مساجد رومالوں میں منہ لپیٹے محراب میں کھڑے ہوتے ہیں۔ آج لاہور میں اورنگزیب کی بادشاہی مسجد کا صحن مولانا عبدالقادر آزاد کے دل و دماغ کی طرح ویران ہے۔ وزیر خاں کی مسجد کا شاندار صحن کبوتروں کی بازی گاہ بنا ہوا ہے۔ سنہری مسجد کا تو کوئی نام تک نہیں لیتا۔ مسلم مسجد تحریک پاکستان کے دور میں تحریک کا مرکز تھی اب اس کا بلند و بالا مینار مولانا مسلم مرحوم کی قبر پر کھڑا اہل دل کے کارواں کی راہ دیکھ رہا ہے۔ داتا گنج بخش کی ماڈرن مسجد نظروں کو تو لبھاتی ہے لیکن جن مساجد میں محکمہ اوقاف کے کلرکوں کا سایہ پڑ جائے وہ ویران ہو جاتی ہیں یہاں تو افسر آتے ہیں وزیر آتے ہیں وزیراعلیٰ آتے ہیں بلکہ وزیراعظم آتے ہیں۔ یہ بلائیں اور یہ مسجدیں''۔

مندرجہ ذیل اقتباس میں مساجد کی انتظامیہ اور کمیٹی کے لوگوں کی بڑے احسن اور موثر پیرائے میں خبر لی ہے۔

''جاہل دنیادار کمیٹیاں بنا کر مسلط ہیں وہاں محراب و منبر کی آبرو کس طرح برقرار رہ سکتی ہے۔ جاہل محافظ مسجد کے صحن اور غسلخانوں میں تو ''سنگ مرمر'' لگواتے ہیں اور محراب و منبر کے وارث کی جس طرح حفاظت و نگہداشت کرتے ہیں اس سے روح کانپ اٹھتی ہے''

حکمرانوں کی بے راہ روی پر اس طرح لطیف طنز کرتے ہیں۔

''پاکستان ایک اسلامی ملک ہے مگر اس پر حکمرانی کا حق ''غیر اسلامی مسلمانوں'' کو ملا ہے۔ جو فرعون کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور آخرت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اُٹھنا چاہتے ہیں''۔

علمائے کرام کی ہمت بڑھانے کا ایک حسین انداز ملاحظہ ہو۔

''ہم اُن خطبائے کرام کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں جو موجودہ سیاسی اور معاشی دباؤ کے باوجود اپنی مساجد کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔ ہم ان غریب ائمہ کرام کی ہمت کی داد دیتے ہیں جو ''نانِ جویں'' کھا کر ''قوت حیدری'' کا مظاہرہ کرتے ہیں ہم ان بے سروسامان علمائے کرام کی قدر کرتے ہیں جو ان طوفانوں میں بھی اللہ کے گھروں کو روشن رکھے ہوئے ہیں''۔

باتیں سعید بدر کی

نعت کیا ہے اشک ہائے تر سے موتی رولنا
آنسوؤں سے بات کرنا منہ سے کچھ نہ بولنا

ضروری نہیں کہ ہر شاعر اپنے تخیلات کی عملی تصویر ہو لیکن اگر ایسا ہو تو میرے خیال میں شاعر علی الاطلاق تب ہی ہوگا۔

اہل فن اور اہل تنقید نے شاعر کی پیمائش فن کے جتنے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں ان کا تو مجھے ادراک نہیں لیکن متذکرہ بالا خیال کی رو سے حضرت سعید بدر ایک کامل شاعر ہیں کیونکہ میں نے انہیں نعت کے باب میں موتی رولتے بھی دیکھا ہے اور آنسوؤں سے بولتے بھی۔

حضرت سعید بدر اس وقت سے نعت کہہ رہے ہیں جب نعت فیشن، ضرورت یا مجبوری نہیں بنی تھی۔ اسی باعث ان کی نعت ایسی سطحی چیزوں سے بہت ارفع ہے۔ اور یہی وصف انہیں اپنے عہد کے شاعروں کے ہجوم میں امتیازی شان عطا کرتا ہے۔

حضرت سعید بدر سے نیازمندی تقریباً ایک عشرہ پر محیط ہے۔ مجھے ان کی علمی سرگرمیوں، فکری وابستگیوں، عملی پہلوؤں، شخصی رویوں، علم نوازیوں، ادب دوستیوں اور وضع داریوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔

زندگی میں ایسے لوگ کم ہی دیکھے ہیں کہ پہلی ملاقات میں قائم ہونے والا تاثر اگلے اور قدرے بے تکلف ملاقاتوں میں بہتری آتی ہو ورنہ بڑے بڑے نام ور یہاں پر ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا'' صادق آتا ہے۔ بدر صاحب کے حوالے سے یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جوں جوں ان سے قریب بڑھی توں توں پہلی ملاقات میں قائم ہونے والا تاثر خوب سے خوب تر ہوتا گیا۔

ابتدائی ملاقاتوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ تعارف کرانا پڑا جو مجھے شاق

گزرا غالباً تیسری ملاقات ہی میں نے طنزاً کہا بدر صاحب پہچان لیا ہے یا آج پھر تعارف کرانا پڑے گا۔ فرمانے لگے میں نے پہچان تو لیا ہے صرف نام ذہن میں نہیں آرہا۔ آج آخری بار تعارف کرادیں آئندہ یہ نوبت نہ آئے گی۔ پھر واقعی جب بھی کسی ادبی تقریب یا اردو بازار میں ملاقات ہوئی تو بڑی گرم جوشی سے ملے۔

میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی نظم ونثر اصلاح کی غرض سے دکھانی شروع کی جب بھی کوئی تازہ چیز ہوتی انہیں دکھاتا۔ اس طرح ان سے کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ میری ایک کتاب ''نظام مصطفیٰ میں جہیز کا تصور'' پر بڑا بھرپور اور تفصیلی مقدمہ لکھا۔ پھر دوستوں کی لائن لگ گئی۔

پروفیسر شکیب وجدانی صاحب نے اپنی کتاب ''محمد جان محبوبی'' پر مقدمہ لکھوایا۔
علامہ عبدالحق ظفر چشتی مرحوم نے ''اجلے اجلے لوگ'' پر لکھوایا۔
علامہ اللہ بخش نیر نے ''مقالات نیر'' پر لکھوایا۔
ڈاکٹر اشرف آصف جلالی نے ''غائبانہ جنازہ جائز نہیں'' لکھوایا۔
ضیاء الحق نقشبندی نے کئی کتابوں پر لکھوایا۔

اور ان سب کے لئے وسیلۂ قلیلہ میں ہی بنا۔ جس دوست کو بھی 965 نظا۔ بلاک کا راستہ دیکھایا وہ کبھی مایوس نہیں ہوا۔ بلکہ سب نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق ''بدر'' سے روشنی پائی۔ اپنی کتابوں کے ورق جگمگائے اور دامن پُرنور کیے۔

سعید بدر صاحب کے بارے میں وقتاً فوقتاً ملک کے نامور اہل قلم اپنے تاثرات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ قارئین کرام آیئے ان مشاہیر کے تاثرات ملاحظہ کریں۔

صف اول کے نقاد ڈاکٹر انور سدید بدر صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''سعید بدر صاحب نے اپنی نعتوں کا غیر مطبوعہ مجموعہ ''آیاتِ نور'' مجھے مطالعے کے لئے عنایت فرمایا تو یہ بات بتا کر مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ انہوں نے جو پہلا شعر کہا وہ عقیدت نبوی ﷺ کے وفور

کا نتیجہ تھا اور اس کے بعد بھی انہوں نے نعت کے سوا کسی اور صنفِ سخن کو قبول نہیں کیا۔ اس مرحلہ پر مجھے علامہ اقبال یاد آئے جنہوں نے ''نعت'' کے عنوان سے کوئی الگ نظم نہیں لکھی لیکن ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' میں متعدد ایسی نظمیں موجود ہیں جن میں نعت رسولِ عربی ﷺ کا جوہر بدرجۂ اُتم موجود ہے اور انہوں نے ہی یہ اشعار لکھے:

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کُل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا، فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

تو انہیں آنحضرت ﷺ کا بہترین قصیدۂ عقیدت قرار دے کر تسلیم کیا گیا کہ یہاں ''علامہ اقبال بحیثیت نعت گو'' اپنے فن کے معراج پر ہیں۔

شاعری کے فن پر سعید بدر کی قدرت کو دیکھ کر میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ غزل اور نظم کی ہیئت میں ہر موضوع کو اپنی شاعری میں منفرد انداز میں پیش کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے معاصرین کی طرح نعت نگاری کا فریضہ بھی حسن وخوبی سے ادا کر سکتے تھے۔ ''آیاتِ نور'' میں ان کے ''عرض تمنا'' کا احوال پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ وہ عصر حاضر کا تمام تماشا دیکھ رہے تھے اور اس تماشے کا کردار بھی تھے، ان کے باطن میں ایک واضح ردِعمل بھی مرتب ہو رہا تھا لیکن جب شاعری کی طرف آئے اور پہلی نعت ارتجالاً کہہ ڈالی تو معاشرتی ردِعمل پیش کرنے کے لئے

انہوں نے نثر کی صنف کو مختص کر دیا اور اس کے پُر خلوص اظہار کے لئے صحافت کا پیشہ اختیار کیا جس میں ان کی گفتگو براہِ راست عوام سے تھی، میرا اندازہ ہے کہ برِ ہند کے بیشتر شاعروں نے بشمول علامہ اقبال غزل کے ریاض کے بعد نعت نگاری اختیار کی، اقبال کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ انہوں نے رسمی نعت کہنے کی بجائے عشقِ نبوی ﷺ کو اپنی شاعری کی بُنت میں شامل کر دیا اور نعت نگاری کے فریضے کی ادائیگی ناموسوم طور پر رسمی نعت نگاروں سے بہت اچھے انداز میں کی۔

سعید بدر کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کا ریاض ہی نعت نگاری میں کیا اور اظہار پر قدرت حاصل کی تو اس کے ہر مرحلے پر اپنی عقیدت اور مودتِ نبوی ﷺ ہی کو راہنما بنایا اور یہ بات بالخصوص متاثر کرتی ہے کہ انہوں نے اقبال کی نعت نگاری کے زیادہ اثرات قبول کئے اور اپنی نعت کو نبی کریم ﷺ کی صفاتِ عالیہ کی ثناء خوانی اور بنی نوع انسان کے لئے ان کے فیوض و برکات کے تذکرے کے لئے مختص کیا تو علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ نعت نگاری میں امتِ مسلمہ کے مسائل کی پیشکش میں اقبال کے طریق کو بھی تخلیقی سطح پر قبول کیا اور غزل کی ہیئت میں تسلسلِ اظہار کو سمونے کی کاوش کی۔

بزرگ اور استاد شاعر حضرت نجمی رجبوری (بدایونی) سعید بدر صاحب کی فنی صلاحیتوں اور شخصی خوبیوں کو اشعار کا جامہ ایسی طرح پہناتے ہیں۔

اے مکرم بدر صاحب اجتہاداتی زنیف — واہ! تیری آئینہ سیمائی و طبع نظیف!
کیسی چیدہ اور پسندیدہ ہے تیری خُو و بُو — ہے یگانوں اور بیگانوں کو تو یکساں عطیف

ہے ذمائم کے خس و خاشاک سے تو پاک صاف — مثلِ خنداں گل ہے تیری خاطر عاطر لطیف
جان و دل کی تازگی ہے تیرا حُسنِ ابتسام! — واہ! تیری دید و رویت محترم فاضل ظریف!
اے مکرم واہ تیرے قد و قامت کی بہار — ہو گلستان میں جیسے سرو کا نخلِ رفیف
تیرے خُلق عاطر و خندہ جبینی سے مدام — تجھ سے ہوتا ہے نہایت خوش ترا ہر اک رصیف
آدمیت کو ہے تیری ذات بابرکت عمیم — جذب بہبودیٔ انساں ہے تیرے دل میں لطیف
اے مکرم خوش رہے تُو اور تیرا خانداں — لطفِ حق سے ہو نہ ہرگز کوئی غمناک و اسیف

تحفۂ نجمی نعتِ مصطفیٰ خیر الانام
از کرم مقبول فرما محترم مردِ حنیف

ممتاز شاعر جناب جعفر بلوچ، سعید بدر صاحب سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"اپنے اسلوب میں جناب سعید بدر کہیں کہیں شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال سے بھی فیض یاب اور پرتو اندوز ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ زیرِ نظر نعتوں اور ان کے بعض حواشی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے جناب بدر کو گہرا شغف ہے اور اپنے اس تاریخی شعور سے وہ اپنے کلام میں خوب استفادہ کرتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاصر نعت نگاروں کے حلقۂ تقدیس میں جناب سعید بدر آبرومندانہ شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس باب میں ان کے رسوخ و اعتبار کو مضاعف فرمائے۔ (آمین!)

سعید بدر صاحب کو حج بیت اللہ کی سعادت کے حصول پر لندن کے بزرگ دانشور پروفیسر محمد شریف بقا نے اپنے تخیل کو ان اشعار کا پیراہن عطا کیا ہے۔

خدا کے گھر کی زیارت کمالِ صدق و یقیں
خدا کے گھر کی زیارت دلیلِ عشقِ رسول

خدا نے تجھ کو عطا کی سعادتِ دارین
ہمارا ہدیۂ تبریک کر اے بدرا قبول

نعت گو شاعر جناب عبدالعزیز خالد رحمتہ اللہ علیہ ایک آزاد نظم میں سعید بدر صاحب سے اس طرح اظہارِ عقیدت کرتے ہیں۔

سرخوش و پُر سنور ہے کیسا
لب ولہجہ سعید بدر کا
یہ لب ولہجہ ہے وہ
جس کو نبھانے کے لئے
"کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے"

سعید بدر صاحب کی نعتیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر محمد اکرم رضا فرماتے ہیں:

"سعید بدر ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو ذہن کے البم میں سجائے ہوئے ہیں۔ جب ماضی کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو حضور ﷺ کی آمد کے حوالے سے اُمت اسلام کا تابناک ماضی ہر مورخ کی نگاہوں کو خیرہ اور قلم کی نوک کو خوشبو بداماں بناتے نظر آتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ سے قرونِ وسطیٰ کی طرف آتے ہیں تو ان کا لہجہ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر جب عہد حال کے تپتے ہوئے صحرا میں مسلمانوں کی آبلہ پائی دیکھتے ہیں تو بے اختیار ان کا وجدان چیخ اُٹھتا ہے۔ انہیں ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے یہ گلستان سدا بہار سے نکل کر سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج کے حصار میں آگئے ہیں۔



محمد نعیم طاہر رضوی

کنزالایمان سوسائٹی کے صدر اور کنزالایمان جریدے کے مدیر شہیر بھائی محمد نعیم طاہر رضوی کی شخصیت نے سنجیدگی، ذکاوت، ایثار اور استقلال کے عناصر اربعہ سے تشکیل پائی ہے پچھلی ربع صدی نے انہیں ایک بہترین منتظم کے طور پر متعارف کرایا ہے۔

آپ کی پیدائش 20 مارچ 1961ء بروز پیر جناب نذیر احمد صاحب کے ہاں 881 کاشانہ عنایت بزاز، محلہ صدر بازار، لاہور کینٹ میں ہوئی۔

آپ نے پرائمری تک کی تعلیم فیڈرل گورنمنٹ سکول نمبر 2 میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے پاس کیا اور ایف اے کا امتحان گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں پاس کیا۔ اور پاک جرمن کالج لاہور سے آپ نے سول ڈرافٹس مین کا ڈپلومہ کیا۔ اس کے علاوہ دینی تعلیم میں سب سے پہلے ناظرہ قرآن مسجد سکندر خان بزاز محلہ سے پڑھا۔ تجوید و قرأت آپ نے جامعہ تجوید القرآن سے پڑھی، اس کے علاوہ دورہ تفسیر القرآن جامعہ غوثیہ مصطفیٰ آباد لاہور سے کیا۔

1974ء میں جب تحریک ختم نبوت چلی تو مولانا محمد نعیم طاہر رضوی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اور آپ ایک کارکن کی حیثیت سے ختم نبوت کے جلسے اور جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

1977ء میں تحریک نظام مصطفیٰ چلی اس میں بھی آپ نے بھرپور کردار ادا کیا۔

1999ء میں جب نجدی حکومت نے حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا والدہ محترمہ

حضور سید دو عالم ﷺ کے مزار مقدس کی پامالی کی تو اس وقت ایک زبردست تحریک کا آغاز ہوا اور آپ اس تحریک میں پیش پیش رہے اور آپ نے اپنے ماہنامہ کنز الایمان کا خصوصی ایڈیشن سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نمبر نکالا۔

31 جولائی 2002ء کو جب نعلین حضور ﷺ بادشاہی مسجد سے چرا لئے گئے تو اس کی بازیابی کے لئے پورے پاکستان میں ایک زبردست تحریک کا آغاز ہوا جس میں آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور آپ کے گھر میں آپ کی گرفتاری کے لئے متعدد مرتبہ پولیس نے چھاپے بھی مارے۔

14 فروری 2006ء کو تحفظ ناموس رسالت کے لئے اور یورپی ممالک فرانس، ڈنمارک کے اخبارات میں چھپنے والے حضور ﷺ کے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے خلاف زبردست تحریک کا آغاز ہوا جس میں آپ نے بہت سے پروگرام منعقد کئے اور مختلف قسم کے مقدمات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

بہترین تعارف وہی ہوتا ہے جو ''وقت'' کراتا ہے ورنہ ستائش باہمی کے کئی کردار تو خود اپنی خبریں اور تصویریں لئے اخباروں کے دفاتر کی خاک چھاننے والے کئی مصلح اور کئی قائد دیکھتی آنکھوں گرد راہ ہو چکے۔ نعیم طاہر رضوی ایسے کڑیل جوان نے ذمہ داری کا جو بوجھ اپنے شانوں پر سہارا اٹھادہ ماہ و سال کی گردش کے باوجود آج بھی اٹھایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بزرگی کے آثار بھی نظر آنے لگے ہیں لیکن نہ کندھے بوجھل ہوئے نہ بازو شل ہوئے بلکہ پیش قدمی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں صرف گویوں کی قدر باقی رہ گئی ہے قلمی جہاد بڑے دل گردے کا کام ہے۔

لیکن نعیم بے سرو سامانی کے باوجود اپنے چند مخلص ساتھیوں سے مل کر بڑی خاموشی اور صبر و ضبط کے ساتھ تاریخ ساز جدوجہد کر رہے ہیں میڈیا کی تیز و تند طوفانی لہروں میں بہنے والی قوم کو ''مطالعہ'' کی دعوت دینا پہاڑوں سے سر ٹکرانے والی بات ہے مگر شاید نعیم طاہر رضوی کا عزم

پہاڑوں سے بہت بلند ہے کہ 25 سال سے قوم کے نونہالوں کو خواندگی کا شعور بانٹ رہے ہیں۔

اگر ان کے پرچے کے خصوصی شماروں کا شمار کیا جائے تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اتنے ''نمبرز'' کسی اور جریدے کی تاریخ میں نہیں مل سکتے جبکہ ان نمبروں کے علاوہ مختلف کتابیں اور کتابچے اس پر مستزاد ہیں۔ پھر درس قرآن، محفل ذکر اور مذہبی تہواروں پر تقریبات تو شمار سے باہر ہیں۔ اور پھر دوسری تنظیموں کے ساتھ تعاون کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ قومی امام احمد رضا کانفرنس کا تو ذکر ہی کیا پنجاب بھر میں یہی ایک سالانہ کانفرنس ہے جس نے فکر رضا کی لاج رکھی ہوئی ہے۔ اور اب تو ماشاء اللہ اس کا دائرہ بلوچستان تک وسیع کر دیا گیا ہے۔

مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی مدظلہ العالی

اس عالم رنگ و بو میں بہت سے لوگوں نے نام کمایا۔ کسی کے آباؤ اجداد اس کی شہرت کا باعث بنے اور کسی کا خاندان اس کی ناموری کی بنیاد بنا۔ کوئی کسی شہر کی نسبت سے معروف ہوا اور کوئی کسی مدرسے یا آستانہ کا مرہون منت ہوا۔ لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے عرض کر سکتا ہوں۔ کہ میرے ممدوح کریم حضرت مولانا ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی آباؤ اجداد کی بنیاد پر نہیں پہچانے گئے بلکہ اُن کے آباؤ اجداد اُن کی بنیاد پر پہچانے گئے۔ وہ خاندان کی وجہ سے معروف نہیں ہوئے بلکہ خاندان اُن کی وجہ سے معروف ہوا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد جلالی صاحب کی نسبت سے آستانہ عالیہ بھکھی شریف اور جامعہ محمدیہ نوریہ رضویہ سے متعارف ہوئی۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے برصغیر کے بے شمار لوگ امام احمد رضا کی نسبت سے آستانہ علیہ مارہرہ شریف سے واقف ہوئے تھے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

چشم بد دور آج ''خطابی'' اور ''کتابی'' دونوں جہانوں میں حضرت مولانا کا نام ایک معتبر حوالہ ثابت ہو رہا ہے۔ جہاں کہیں اُن کے خطاب کی تاریخ مقرر ہوتی ہے سامعین دن گنتا شروع کر دیتے ہیں اور جب اُن کی کسی نئی کتاب کا اشتہار دیکھتے ہیں تو اُردو بازار، دربار مارکیٹ اور گنج بخش روڈ کے چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے عمدہ ذخیرہ الفاظ، ٹھوس طرز استدلال، زبردست مناظرانہ گرفت، نت نئی تراکیب، خوبصورت شعری انتخاب، اور ادبی چاشنی کے باعث ہر سطح کے وقار کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ اپنے بے پناہ مطالعہ، زرخیز ذہن اور سیال قلم کے ہتھیاروں سے قاری کے دل و دماغ کو فتح کر لیتے ہیں۔

ان کی تعلیمی قابلیتوں کا رشتہ جامعہ محمدیہ نوریہ رضویہ بھکھی شریف منڈی بہاء الدین، پنجاب یونیورسٹی، اور جامعہ بغداد شریف سے جڑا ہوا ہے اور وہ محاورۃً نہیں حقیقتاً اپنی ہر مادر علمی کا نام روشن کر رہے ہیں اور ہر مادر علمی اپنے اس ''سپوت'' بجا طور پر فخر کرتی ہے۔

ان کی فکری جولانیوں کے پس پردہ شمالی پنجاب کی معروف روحانی شخصیت جنید زماں حضرت پیر سیّد جلال الدین شاہ مشہدی رحمۃ اللہ علیہ، قائد ملت اسلامیہ حضرت امام شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ، ملک المدرسین حضرت علامہ عطا محمد بندیالوی (خیر آبادی) رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ عبدالکریم محمد المدرس البغدادی مدظلہ کا ''دست تربیت'' کارفرما ہے۔

ان کی خوبی تحریر ان کے وسعت مطالعہ کی آئینہ دار ہے وہ عربی اردو اور انگلش لٹریچر کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور ایہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اپنے ''حاصل مطالعہ'' میں اپنے قارئین کو شامل رکھتے ہیں۔ وہ مطالعہ کے نتائج کو اپنے ضمیر پر نازل کرتے اور پھر اپنے نوک قلم سے قرطاس ابیض پر بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

گذشتہ دنوں ضلع لاہور کی تحصیل کینٹ کے ایک دور افتادہ سرحدی گاؤں میں جامعہ صراط مستقیم کے نام سے ڈاکٹر اشرف آصف جلالی کی سرپرستی میں ایک دینی ادارے کا افتتاح ہوا۔ اس موقع پر تازہ نظم

صراط مستقیم

عظمتوں کا اک حوالہ ہے صراط مستقیم
ظلمتوں کا اک اجالا ہے صراط مستقیم
ہے محمد کی عطا سردار احمد کا جلال
نسبتوں کا بول بالا ہے صراط مستقیم
دین کے انوار اس سے پھیل جائیں چار سو
یہ جہالت کا ازالہ ہے صراط مستقیم

انشاء اللہ کام بھی ہوگا نرالا دین کا

نام جو سب سے نرالا ہے صراط مستقیم

شاہ جلال الدین کے فیضان علمی کی نمود

حضرت آصف کا ڈھالا ہے صراط مستقیم

جو بھی دیکھے گا اسے بولے گا وہ بے ساختہ

اللہ اللہ کیا ہی اعلیٰ ہے صراط مستقیم

ہے اسی کے رت جگوں اور شب بیداری کا صلہ

جس کے ہاتھوں نے سنبھالا ہے صراط مستقیم

حضرت آصف جلالی چاند ہے اس دور کے

اور انکے گرد ہالہ ہے صراط مستقیم

اے سعیدی افتتاحی جلسے میں آیا ہوں

ہاتھ میں شعروں کی مالا ہے "صراط مستقیم"

پانچواں باب

انٹرویوز

صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہوئے آگ میں کودنے والا عظیم عاشق رسول

محمد پناہ ٹوٹانی

قارئی کرام محمد پناہ ٹوٹانی اور ہارون گانجو دیوبندی کا مباہلہ کئی اخبارات کی زینت بن چکا ہے سینکڑوں لوگوں نے خود وہاں جاکر تحقیقات کیں اور عینی گواہوں سے ملے جیسے جیسے یہ واقعہ شہرت پذیر ہو رہا ہے لوگ محمد پناہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ ابھی تک کسی اخبار یا رسالے نے محمد پناہ کا باقاعدہ انٹرویو شائع نہیں کیا یہ اعزاز ماہنامہ ''فیضان مدینہ'' کے حصے میں آیا ہے کہ محمد پناہ کا پہلا انٹرویو شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے قارئین کرام ہماری اس کاوش کو پسند فرمائیں گے۔

11 اپریل بروز ہفتہ مغرب کے وقت میں لاڑکانہ پہنچا مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد حضرت پیر صاحب پگاڑا کے خاندان عالیہ راشدیہ کے چشم و چراغ معروف سکالر حضرت پیر سید زین العابدین راشدی صاحب کے ہاں حاضر ہوا اور محمد پناہ کے انٹرویو کے حوالے سے بات کی راشدی صاحب نے فرمایا کہ ابھی آپ آرام کریں صبح محمد پناہ سے ملاقات کریں گے۔

12 اپریل صبح سویرے سید بھورل شاہ جیلانی نے علامہ تاج محمد صاحب سے وقت مانگا تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ آپ 9 بجے تشریف لے آئیں محمد پناہ موجود ہوں گے۔

لاڑکانہ سے تقریباً 32 کلومیٹر دور رواڑہ کے مقام پر پہنچے تو پتا چلا کہ شہر میں محمد پناہ کے پیر مرشد حضرت پیر طریقت رہبر شریعت سائیں غلام حسین شاہ بخاری صاحب کا کوئی پروگرام ہے لہٰذا آپ کو انتظار کرنا پڑے گا علامہ تاج محمد صاحب کے چھوٹے بھائی نے بڑا تعاون کیا دوپہر کو سندھ کا روائتی کھانا بڑے اہتمام سے پیش کیا پھر ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دیا دوپہر کے بعد علامہ

تاج محمد صاحب تشریف لائے اور عصر کی نماز کے دوران محمد پناہ آکر جماعت میں شامل ہو گئے عصر کے بعد ان سے ملاقات ہوئی اور قارئین کی دلچسپی کے لئے مندرجہ ذیل گفتگو کی۔

سائیں محمد پناہ صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں ملاقات کا وقت دیا

پہلا سوال آپ سے یہ ہے کہ آپ کے نام کے ساتھ ٹوٹانی لکھا جاتا ہے اس کا کیا مطلب ہے یہ کوئی ذات وغیرہ ہے؟

جواب: جی ہاں ہمارا قبیلہ چانڈیہ ہے اور اس کی ایک شاخ ٹوٹانی ہے اس لئے ہمارے نام کے ساتھ ٹوٹانی لکھا جاتا ہے۔

سوال: آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی کیا ہے:

جواب: میرے والد محترم کا نام محمد ملوک ٹوٹانی ہے۔

سوال: اس وقت آپ کی عمر کتنی ہو گی۔

جواب: میری عمر 26 سال کے قریب ہے۔

سوال: آپ کے اور کتنے بھائی ہیں۔

جواب: میرے علاوہ پانچ بھائی اور ہیں مجھ سمیت چھ بھائی ہیں۔

سوال: آپ کا نمبر کونسا ہے۔

جواب: میرا پہلا نمبر ہے باقی سب بھائی میرے سے چھوٹے ہیں۔

سوال: آپ کی شادی تو ضرور ہو چکی ہو گی۔

جوب: ہمارے ہاں سندھ میں بہت کم عمری میں شادی ہو جاتی ہے۔ میری شادی بھی لڑکپن میں ہی ہو گئی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔

سوال: ماں باپ نے آپ کی دوسری شادی نہیں کی۔

جواب: ابھی ماں باپ کوشش کریں گے تو دوسری شادی کر لوں گا۔

سوال: آپ نے کس سکول میں تعلیم حاصل کی۔

جواب: میں کسی سکول وغیرہ میں نہیں پڑھا بالکل اَن پڑھ ہوں۔

سوال: کسی دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔

جواب: نہیں جناب میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں کسی جگہ پر بھی نہیں پڑھا۔

سوال: کس پیشے سے منسلک ہیں۔

جواب: پیشہ مزدوری ہے زمینوں پر (کاشتکاری) کام مل جاتا ہے تو وہ کر لیتے ہیں ٹریکٹر کی مزدوری مل جائے تو وہ کر لیتے ہیں۔ بس مزدور آدمی ہیں اپنا گزارہ کر لیتے ہیں یہی پیشہ ہے۔

سوال: آپ کے والد صاحب کیا کام کرتے ہیں۔

جواب: وہ بھی مزدوری کرتے ہیں زمینوں پر کام وغیرہ مل جاتا ہے۔

سوال: بعض اخبارات نے یہ افواہ پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کا ہارون کے ساتھ ''ختم نبوت'' کے موضوع پر مباہلہ ہوا تھا آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔

جواب: یہ بالکل غلط بات ہے بالکل جھوٹ ہے ہماری بحث میں ختم نبوت کا ذکر بھی نہیں آیا ہمارا جھگڑا تو صرف حضور اکرم ﷺ کے حاضر و ناظر اور مختار ہونے پر ہوا تھا۔

جو لوگ ختم نبوت کا ذکر کر رہے ہیں تو گویا وہ خود اپنے بھائی (ہارون) کو مرزائی ثابت کر رہے ہیں۔

آپ گواہوں سے معلوم کریں جو بالکل غیر جانبدار ہیں بلکہ اکثر گواہ ہارون کے قریبی ہیں اور مجھے جانتے تک نہیں لہٰذا ان کی بات میں وزن ہونا چاہئے۔

سوال: کچھ لوگوں نے یہ بھی شور کر رکھا ہے کہ زبردستی ہارون کو آگ میں ڈالا گیا ہے۔

جواب: آگ میں جانے سے پہلے ہم دونوں نے نفل پڑھے دعائیں مانگیں کئی لوگ وہاں موجود تھے پھر زبردستی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں تو اکثر ہارون کے رشتہ دار تھے اور اس کے اپنے لوگ تھے میں بالکل اکیلا تھا نہ وہاں ٹوٹانی قبیلے کا آدمی تھا نہ کوئی میرا دوست تھا تو میں زبردستی کیسے کر سکتا تھا۔

سوال: جب آپ آگ کے اندر کھڑے تھے تو کیسا لگ رہا تھا۔

جواب: بڑا مزہ آ رہا تھا ایسا لگتا تھا کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے اور میں حیران تھا کہ آگ کے اندر ہوا کیسے آ رہی ہے۔

سوال: یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ آپ کی طرف کی آگ سبز ہو گئی تھی۔

جواب: مجھے تو معلوم نہیں میں تو اس وقت جذبات میں تھا اور مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگ کا رنگ کیسا ہے البتہ جو لوگ موجود تھے وہ یہی بتاتے ہیں کہ میری طرف کی آگ سبز تھی اور ہارون دیوبندی کی طرف کی آگ ویسی ہی تھی جیسی آگ ہوتی ہے۔

سوال: آگ سے نکلنے کے بعد کیا ہوا۔

جواب: لوگوں نے خوشی سے نعرے لگائے مجھے مبارکباد دی پھر بعد میں شہر میں جلوس نکالا ایک آدمی ہارون کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس کا علاج کرایا پھر اخباروں میں چرچا ہو گیا لوگ دور دور سے مجھے دیکھنے آتے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔

سوال: آپ کا سارا خاندان سنی بریلوی ہے۔

جواب: بالکل ہم کٹر سنی بریلوی ہیں علمائے اہلسنت بریلوی کے پیچھے چلنے والے ہیں۔

سوال: علمائے اہلسنت میں آپ کا پسندیدہ عالم دین کون ہے۔

جواب: ویسے تو سارے ہی علماء اچھے ہیں ویسے مولانا سعید احمد اسعد صاحب اچھے لگتے ہیں ان کا انداز بہت اچھا ہے اور وہ بہت بہادر آدمی ہیں۔

گواہوں کے بیانات:

نوٹ: دو گواہ ہارون کی برادری کے ہیں اور ایک اس کی خالہ کا لڑکا ہے۔

☆ آگ جلانے والے۔ اللہ ڈنو سوڈر۔ ممتاز آباد۔ وارہ

میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ مباہلہ کے وقت میں وہاں موجود تھا ان دونوں کے پاس ماچس نہیں تھی اس لئے میں نے آگ لگائی آگ لگانے سے پہلے میں نے ہارون

کو منع کیا کہ بحث نہ کرو اور محمد پناہ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ چھوڑ دو جانے دو لیکن دونوں نے میری بات نہ مانی اور کہا کہ ماچس لگاؤ میں نے ماچس لگا دی۔

سوال: کیا آپ محمد پناہ کو جانتے تھے۔

جواب: نہیں۔

سوال: ہارون کو جانتے تھے۔

جواب: جی ہاں ہارون نزدیک کا رہنے والا ہے محمد پناہ ہم سے کافی دور رہتا ہے۔

سوال: آگ میں جانے سے پہلے دونوں کی کیا حالت تھی۔

جواب: محمد پناہ غصے میں سرخ ہو چکا تھا اور زور زور سے رو رہا تھا اور مدینے والے سائیں کو بلاتا تھا اور ہارون کہتا تھا وہ کچھ نہیں کر سکتے وہ حاضر و ناظر نہیں ہیں تم کیوں بلاتے ہو۔ پھر پہلے محمد پناہ اندر گیا پھر اس کو پکڑ کر کھینچا بس وہ تو فوراً ہی نکل کر بھاگا اس کی داڑھی جل گئی ایک ٹانگ جل گئی اس ٹانگ کی کھال اترتے ہوئے میں نے خود دیکھی اور محمد پناہ کافی دیر آگ میں رہا۔

چھ گواہوں کے بیانات:

ہم خدا تعالیٰ کو مالک اور حاضر و ناظر جان کر تصدیق کرتے ہیں کہ جس طرح محمد پناہ نے بیان کیا اسی طرح ہوا تھا اور ہم سب موجود تھے اور یہ واقعہ دیکھ کر حیران ہو گئے۔

۱) غلام نبی قریشی۔ گاؤں مانجھی خاں سوڈر۔ تحصیل دارہ۔

۲) غلام علی ولد خمیسو خان گامجو (ہارون کی خالہ کا لڑکا)

۳) رانجھن ولد محمد فاضل پیرزادہ (جس ٹریکٹر پر ہارون مزدوری کرتا تھا اس کا ڈرائیور)

۴) محمد اسلم ولد محمد عرس بروہی۔ شہر دارہ۔

۵) غلام حسین ولد جانب خان گامجو۔ گاؤں حاجی غلام محمد گامجو (ہارون کی برادری کا)

۶) غلام حسین ولد مصری خان گامجو گاؤں عبدالکریم گامجو (ہارون کی برادری کا)

نوٹ! اس گواہ نے ہارون کا ابتدائی علاج اپنی جیب سے کرایا!

یورپ کے پانچ ہفتہ کے تبلیغی دورے سے واپسی سے مناظر اسلام

حضرت علامہ پروفیسر سعید احمد اسعد سے انٹرویو

مسلک حق اہلسنت کے دفاع اور ترجمانی کا فریضہ ادا کرنے کے لئے ہر دور میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ایسے بے باک، باکردار، عالی ہمت خطیب اور مناظر اسلام عطا فرمائے ہیں جو اپنی بہترین خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر دلیرانہ اور منصفانہ انداز میں اہل سنت کے افکار ونظریات کا پرچار کرتے رہے ہیں۔

برصغیر میں پچھلے صدی میں نجدیت کا جو طوفان بدتمیزی آیا پہلے پہل اعلیٰ حضرت اور ان کے خلفاء نے اس کا مقابلہ کیا اعلیٰ حضرت کے خلفاء میں شیر بیشہ اہل سنت مولانا حشمت علی لکھنوی، عالمی مبلغ اسلام حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی، پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری خصوصیت کے ساتھ اس میدان کے مردان حق تھے۔

قیام پاکستان کے بعد جو بلند پایہ مناظر خطیب سامنے آئے ان میں مولانا عنایت اللہ، مولانا محمد عمر اچھروی، قائد اہل سنت امام شاہ احمد نورانی، ابوالنور مولانا بشیر احمد اور خطیب پاکستان مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کے اسماء گرامی نمایاں نظر آتے ہیں۔

ان بزرگوں کا تسلسل کئی بہادر اور جرأت مند مناظرین کی شکل میں جاری ہے جن میں ایک ممتاز و معتبر نام مناظر اسلام حضرت پروفیسر محمد سعید احمد اسعد کا ہے۔ حضرت مناظر اسلام حال ہی میں یورپ کے اڑتیس روزہ دورے سے واپس تشریف لائے تو ہم نے فیضان مدینہ کے قارئین کی ضیافت قلبی اور معلومات ودلچسپی کے لئے ان سے جامعہ امینیہ فیصل آباد میں ملاقات کی اور حسب ذیل گفتگو کی۔

سوال: حضرت ہم آپ کو بھرپور اور کامیاب دورہ پر مبارکباد پیش کرتے ہیں سب سے پہلے یہ فرمایئے کہ آپ ورلڈ اسلامک مشن کی طرف سے تشریف لے گئے تھے یا کسی اور تنظیم نے آپ کو مدعو کیا تھا۔

جواب: یورپ کے مسلمان ٹیکسی ڈرائیوروں کی ایک تنظیم ہے اس کے عہدیداروں کی طرف سے میری دعوت تھی ان کا کہنا تھا کہ برطانیہ میں کئی بدعقیدہ مولوی شور برپا کئے رکھتے ہیں لہٰذا ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی سنی عالم دین ان کا معقول جواب دے بلکہ ان کو مناظرہ کا چیلنج کرے۔

سوال: جب آپ برطانیہ پہنچے تو وہاں کے مسلمانوں نے اپنے جذبات کا کس طرح اظہار کیا؟

جواب: وہاں کے مسلمان جو غیر قوموں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے ان کے اندر مقابلہ کا رجحان پایا جاتا ہے اور یہی جذبہ ہے ان کو متحرک رکھتا ہے میرے وہاں پہنچنے سے پہلے انہوں نے استقبال کے سارے انتظامات بڑے منظم طریقے سے مکمل کر لئے تھے اور مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ دیار غیر میں تقریباً دس ہزار لوگوں نے میرا استقبال کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

سوال: سب سے پہلا پروگرام کس جگہ منعقد ہوا؟

جواب: پہلا پروگرام یورپ کی سب سے بڑی مسجد گھمگولیہ مسجد برمنگھم میں ہوا۔

سوال: عنوان کیا تھا؟

جواب: آپ جانتے ہی ہیں میرا عنوان تو حضور سرور دو عالم ﷺ کی عظمت اور محبت ہی ہوتا ہے وہاں زیادہ تر پروگرام اسی مقدس عنوان کے تحت ہوئے۔

سوال: اس جلسہ کا کیا رد عمل ہوا؟

جواب: پہلے ہی جلسے کے بعد وہابیوں کو سانپ سونگھ گیا اور اہل سنت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عام طور پر یورپ میں صرف ہفتہ اور اتوار کو یعنی چھٹی کے دن جلسے ہوتے ہیں مگر اس جلسہ کا اتنا اثر ہوا کہ لوگوں نے جلسوں کے لئے اپنی اپنی ملازمتوں سے چھٹی کر کے بھی خطابات سنے۔ تاجروں

نے اپنی سرگرمیوں میں کمی کی اور محبت کے ساتھ پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔ ہر روز پروگرام ہوتا تھا اور ہر روز نئے جذبے کے ساتھ لوگ بھرپور شرکت کرتے تھے اور آخری دنوں میں تو تین تین چار چار جلسے روز بھی ہوئے لیکن لوگوں کے جوش وخروش میں فرق نہیں آیا۔

سوال: تقریر کس زبان میں ہوئی تھی؟

جواب: اردو میں۔

سوال: کوئی مناظرہ وغیرہ بھی ہوا؟

جواب: پہلے تو اہل حدیث بہت شور کرتے تھے اور مناظرے کے چیلنج کرتے تھے۔ میں نے جا کر چیلنج قبول کیا اور ان سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر راہ فرار اختیار کی کہ ہم گڑے مردے نہیں اکھاڑنا چاہتے۔

سوا: یہ کس اہل حدیث نے کہا؟

جواب: عبدالہادی العمری جو جمعیت اہل حدیث یورپ کے سربراہ ہیں۔

سوال: وہ پاکستانی ہیں یا یورپ کے مقامی ہیں؟

جواب: وہ انڈین ہیں۔

سوال: یورپ کے دورہ میں آپ کی دوسرے پاکستانی علماء سے بھی ملاقات ہوئی ہوگی؟

جواب: جی ہاں! حضرت علامہ حامد سعید کاظمی، حضرت مولانا ابوبکر چشتی اور غازی ملت حضرت سید محمد ہاشمی کچھوچھوی کے ساتھ کئی مشترکہ پروگرام ہوئے۔

سوال: مجموعی طور پر وہاں کس مسلک کے لوگ زیادہ ہیں؟

جواب: ظاہر ہے زیادہ تو سنی ہی ہیں لیکن مدارس سنیوں کے کم ہیں سنی زیادہ تر لنگر وغیرہ میں پیسے لگاتے ہیں۔

سوال: لنگر کا رواج وہاں بھی ہے؟

جواب: جی ہاں! وہاں تو بڑا پرتکلف لنگر ہوتا ہے ہر جلسہ میں تقریباً پچاس ہزار

-/50,000 روپے صرف لنگر پر خرچ ہوتے ہیں۔

سوال: اس سلسلے میں آپ نے ان کی راہنمائی نہیں فرمائی۔

جواب: بالکل کی، میں نے ان سے بہت زور دے کر کہا کہ جتنا پیسہ آپ کھانے پینے پر خرچ کرتے ہیں اتنے پیسے میں تو آپ یورپ میں ایک بہترین اسلامی یونیورسٹی بنا سکتے ہیں۔

سوال: اہل سنت کے کون کون سے ادارے وہاں بہتر انداز سے کام کر رہے ہیں۔

جواب: ورلڈ اسلامک مشن سب سے بڑی جماعت ہے اور سب سے قدیم ہے لہٰذا اس کا ہر شہر میں اچھا کام ہے تقریباً ہر شہر میں مساجد اور تعلیمی مراکز ہیں اور وہ بہت اچھے نتائج دے رہے ہیں اس کے علاوہ جامعہ الکرم بھی بہت اعلیٰ پیمانے پر خدمات انجام دے رہا ہے۔

الحجاز کالج بھی اچھا کام کر رہا ہے اب تو ماشاء اللہ دعوت اسلامی نے بھی کام شروع کر دیا ہے۔

سوال: جماعت اہل سنت کا وہاں کیا کردار ہے؟

جواب: جماعت اہل سنت تو فعال ہے لیکن 2 گروپ ہونے کے باعث ظاہر ہے نقصان ہو رہا ہے۔

سوال: آپ نے صلح کروانے کی کوشش نہیں کی؟

جواب: اگر وہ چاہتے تو میں صلح کروانے کو تیار تھا مگر انہوں نے چاہا ہی نہیں۔

سوال: حضرت آپکا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ انوار حیدر کے قارئین کے لئے کوئی پیغام؟

جواب: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

صدر الافاضل کے خدمت گزار ۹۰ سالہ بزرگ

جناب محمد افضل اشرفی ایڈووکیٹ سے انٹرویو

۲۲ فروری ۲۰۰۴ء عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا مقبول الٰہی نعیمی کی راہنمائی میں النعیمیہ کے ''صدر الافاضل نمبر'' کے لئے حضرت صدر الافاضل کے منظور نظر عقیدت مند اور خدمت گزار جناب محمد افضل اشرفی ایڈووکیٹ مدظلہ سے انٹرویو کے لئے ڈیفنس میں واقع ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔

محترم محمد افضل اشرفی صاحب نے صاحب فراش ہونے کے باوجود بڑی خندہ پیشانی اور تحمل سے ہمارے سوالات کے جوابات عنایت فرمائے جو النعیمیہ کے قارئین کی نذر ہیں۔

سوال: قبلہ آپ کا اسم گرامی

جواب: محمد افضل اشرفی

سوال: اشرفی کن بزرگوں کی نسبت سے کہلاتے ہیں۔

جواب: حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی کی نسبت سے مجھے ان سے بیعت کا شرف حاصل ہے

سوال: جناب آپ کی تعلیمی قابلیت۔

جواب: بی اے۔ ایل ایل بی۔

سوال: بی اے کہاں سے کیا۔

جواب: ابتدائی طور پر گورنمنٹ کالج میں پڑھا پھر دیال سنگھ کالج سے بی اے کیا۔

سوال: حضرت آپ کون سے سن میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔

جواب: دسمبر 1940ء میں نکاح ہوا تھا اور جنوری 41ء میں ولیمہ۔

(اس ..... پر عارف نعیمی نے گرہ لگائی کہ گویا آپ کی شادی 2 سالوں پر محیط ہے تو حضرت بہت محظوظ ہوئے اور بے ساختہ مسکراہٹ سے اس کا اظہار فرمایا۔

سوال: جناب یہ بتایئے کہ پہلی مرتبہ آپ نے حضرت صدرالافاضل کو کب اور کہاں دیکھا۔

جواب: 1935ء میں آپ حزب الاحناف کے سالانہ جلسہ دستار فضیلت میں خطاب فرمانے کے لئے تشریف لائے تھے وہیں میں نے پہلے پہل آپ کی زیارت کی اور خطاب بھی سنا۔

سوال: سنا ہے حضرت صدرالافاضل قیام لاہور کے دوران آپ ہی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔

جواب: جی ہاں یہ بعد کی بات ہے تقریباً 1939ء کے بعد سے ہمارے ہاں ٹھہرتے رہے ہوا یہ کہ اندرون دہلی دروازہ حزب الاحناف کے قریب ایک چھوٹا سا مکان سید ابوالبرکات نے حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے نچلے حصہ میں آپ ٹھہرتے تھے۔ آپ کو بیماری کے باعث بار بار پیشاب آتا تھا۔ جس کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنا پڑتا اور بار بار اوپر آنے جانے سے کافی دقت ہوتی تھی۔ میرے والد صاحب نے ایک دن آپ کی دعوت کی جب آپ ہمارے گھر تشریف لائے تو میرے والد صاحب نے آپ کو پیش کش کی کہ آپ جب بھی لاہور آئیں تو ہمارے ہاں قیام کیا کریں۔ ہمارا مکان تقریباً 2 کنال پر تھا اور کمرے کے قریب ہی غسل خانہ وغیرہ بھی تھا اور وضو کی بھی سہولت تھی۔ لہٰذا حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی نے سید صاحب کے مشورے سے میرے والد صاحب کی پیشکش قبول کر لی اور 39 سے 48 تک آپ جب بھی لاہور آئے ہمارے ہی مکان کو شرف بخشا۔

سوال: کیا ہر سال حضرت لاہور تشریف لایا کرتے تھے۔

جواب: مجھے کوئی چھ یا سات مرتبہ کا یاد ہے۔

سوال: جب حضرت آپ کے ہاں ہوتے تو کون سے علماء اکثر ان سے ملنے آتے تھے۔

جواب: بے شمار علماء اور مختلف لوگ آیا کرتے تھے۔ مجھے سب کے نام تو یاد نہیں لیکن حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی، حضرت سید ابوالبرکات اور امام اہل سنت غزالی زماں علامہ احمد سعید

کاظمی ملتان والے اور دیگر کئی بڑے بڑے نام ور لوگ آیا کرتے تھے۔

سوال: آپ کا گھر لاہور کے کس علاقے میں واقع تھا۔

جواب: برکت علی روڈ موچی دروازہ۔

سوال: اب وہ گھر ہے یا نہیں۔

جواب: اب وہ تقسیم ہو گیا ہے کچھ حصہ میں مارکیٹ بن گئی کچھ حصہ باقی ہے۔

سوال: حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی کے معمولات کیا ہوتے تھے۔

جواب: ملاقاتیوں سے فارغ ہونے کے بعد ذکر و فکر ہی میں رہتے تھے۔

سوال: مثلاً ذکر و فکر میں کیا شامل تھا آیا تسبیح وغیرہ زیادہ پڑھتے تھے۔

جواب: نہیں تسبیح تو میرے خیال میں میں نے نہیں دیکھی اکثر انگلیوں پر پڑھتے تھے اور رات عشاء کے بعد کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وظائف کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد تہجد معمول میں شامل تھی۔

سوال: ملاقاتیوں سے اکثر کن موضوعات پر بات کرتے تھے۔

جواب: جو موضوع چھڑ جاتا اس کے مطابق بات کرتے سیاسی موضوع پر بھی مذہبی موضوع پر بھی ہر موضوع پر بات چیت چلتی رہتی تھی۔ علماء سے زیادہ تر علمی اور مذہبی موضوع پر ہی بات کرتے تھے۔

سوال: لوگوں کو کیا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

جواب: حضرت کہہ کر پکارتے تھے اور سید صاحب کو حضرت سید صاحب کہتے تھے۔

سوال: آپ نے کبھی انکے ساتھ سفر کا شرف بھی حاصل کیا۔

جواب: جی ہاں جب بھی کبھی آپ کسی علاقے میں تقریر کے لئے جاتے تو میں بڑے شوق سے ساتھ جاتا تھا۔

سوال: تقریر زیادہ تر کن موضوعات پر کیا کرتے تھے۔

جواب: اکثر میں نے ان کو سیرت رسول اکرم ﷺ پر ہی تقریر کرتے سنا اور تقریر کے دوران

جیسے جیسے سرکار دو عالم ﷺ کا ذکر کرتے تو بے اختیار رونے لگتے اور سامعین بھی آپ کی تقریر سنتے تو ایسا اثر ہوتا کہ سامعین بھی اشکبار ہو جاتے تھے۔ ہر موضوع پر تقریر کرتے تھے سیاسی موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی رہتی۔ لیکن زیادہ تر سیرت پر بولا کرتے تھے۔

سوال: تقریر کی تیاری کیا کرتے تھے یا نہیں۔

جواب: تیاری کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی ویسے جب بھی کہیں جانا ہوتا تو ضرور مطالعہ فرماتے تھے۔ جب 1946ء میں سنی کانفرنس بنارس میں ہوئی تو مجھے کہنے لگے آپ بھی چلیں گے میں نے کہا ضرور جاؤں گا اور پھر میں بنارس سنی کانفرنس میں شرکت کے لئے آپ کے ساتھ گیا وہاں بڑے بڑے لوگوں کی تقریریں سنی میرے پیر مرشد محدث کچھوچھوی نے خطبہ پڑھا اور پاکستان کے حق میں بہت زبردست تقریریں ہوئی۔ اس کانفرنس میں کوئی 20 ہزار کے قریب علماء شریک ہوئے تھے۔

سوال: سفر میں آپ نے نماز کے سلسلے میں ان کو کیسا پایا۔

جواب: اگر نماز کا وقت جا رہا ہوتا تو سیٹ پر بھی پڑھ لیتے تھے ورنہ کوشش کرتے تھے کہ جہاں دس منٹ کے لئے گاڑی رکے وہاں پڑھتے تھے۔

سوال: جب آپ کے ہاں قیام کرتے تو کھانے میں کیا پسند کرتے۔

جواب: کوئی خاص نہیں ہم جو کچھ پیش کرتے بڑے خوش ہو کر کھاتے تھے۔

سوال: کبھی تو کوئی فرمائش کی ہوگی۔

جواب: نہیں جی مجھے یاد نہیں کہ کبھی کوئی فرمائش کی ہو البتہ معالجین کی ہدایات کے مطابق کھاتے تھے۔

سوال: چائے وغیرہ شوق سے پیتے تھے کہ نہیں؟

جواب: نہیں۔

سوال: اخبار کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے؟

جواب: اخبار پابندی سے پڑھتے تھے لیکن خاص خاص خبریں پڑھتے تھے۔ سارا اخبار نہیں پڑھتے تھے اور اخبار پڑھتے پڑھتے تبصرہ بھی فرماتے تھے اگر کوئی اچھی خبر ہوتی تو خوشی سے دوسروں کو بھی سناتے اور کوئی غلط بات ہوتی تو بڑے پرزور انداز میں مذمت کرتے۔

سوال: صدر الافاضل کے ملاقاتیوں میں کبھی کوئی غیر مسلم یا بدعقیدہ بھی آپ کے ہاں آیا۔

جواب: نہیں۔

سوال: آپ کو کبھی کسی بات پر جھڑکا۔

جواب: نہیں جی میں تھا اور ۲ بھائی اور تھے ہمیشہ ہم تینوں سے محبت فرماتے کبھی جھڑکا نہیں۔

سوال: اُن کی محبت کا کوئی انداز جو آپ کو آج تک یاد ہو۔

جواب: شروع میں میری داڑھی پوری نہیں تھی اور حضرت اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے ایک دن بڑے پیار بھرے انداز میں میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فرمانے لگے "مولانا کیا حال ہے" آپ کے اس انداز نصیحت سے میں اتنا متاثر ہوا کہ 70 برس ہونے کو آئے کبھی داڑھی حد شرع سے کم نہیں ہوئی یہ ان کی محبت کا ایک انداز تھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔

سوال: عموماً لاہور میں کتنی مدت ٹھہرتے تھے۔

جواب: یہی کوئی آٹھ دس دن۔

سوال: کہیں جانا ہوتا تو پیدل جاتے یا کوئی سواری ہوتی تھی۔

جواب: قریب ہی تانگہ اسٹینڈ تھا جب کہیں جانا ہوتا تانگہ آ جاتا اور اس وقت تانگہ ہی سواری تھی۔ زیادہ تر اس میں سفر کیا کرتے تھے۔

سوال: جناب قبلہ آپ کے علم میں حضرت صدر الافاضل کی کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہو سکی ہو اور اکثر اس کا ذکر فرماتے ہوں۔

جواب: اکثر ایک بات کا ذکر فرماتے تھے کہ مجھے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی سے بڑا فیض

ملا اور وہ میرے ہر سوال کا جواب تسلی بخش عنایت فرماتے تھے لیکن مجھے اس بات کا افسوس اور حسرت ہے کہ مجھے اعلیٰ حضرت سے قوالی کے موضوع پر بات کرنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ اگر موقع ملا ہوتا تو میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا کہ بہت بڑے بڑے مشائخ قوالی سنتے رہے ہیں اور اس مسئلے پر دلائل پیش کرتا اور یہ کوشش کرتا کہ اعلیٰ حضرت اس مسئلے پر زیادہ سختی نہ فرمائیں۔

سوال: حضرت آپ نے بڑی عجیب بات سنائی ہے کیا حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی قوالی سنتے تھے۔

جواب: نہیں قوالی سنتے تو میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا مگر مذکورہ بات میں نے آپ سے ضرور سنی ہے البتہ میرے شیخ حضرت محدث کچھوچھوی قوالی سنتے تھے انہیں قوالی سنتے دیکھا ہے۔

سوال: اور کوئی یادگار واقعہ:

جواب: ایک مرتبہ مراد آباد جانے کے لئے کسی کو ٹکٹ لینے کے لئے بھیجا تو پتا چلا کہ ٹکٹ 12 روپے کا ہے اور سیٹ نہیں ہے آپ نے دوبارہ سیٹ کے لئے بھیجا تو پتہ چلا کہ ایک سیٹ ریلوے کے متعلقہ افسر نے بلیک میں فروخت کرنے کے لئے خود روک رکھی ہے اور وہ دس روپے مانگ رہا ہے آپ نے بڑی کوشش کی کہ قانوناً وہ سیٹ مل جائے جب کوئی چارہ نہ رہا تو مجبوراً آپ نے دس روپے دیئے اور حاضرین کو گواہ بنا کر فرمایا کہ ہم نے کسی کا حق نہیں مارا نہ رشوت دی ہے لیکن متعلقہ افسر نے ہماری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ کیونکہ ہمیں ہر حال میں مراد آباد پہنچنا ضروری ہے اس لئے ہم یہ دس روپے مجبوری میں دے رہے ہیں۔

شخصیات اسلام پر ایک تاثر

محترم صلاح الدین سعیدی کی کتاب ''شخصیاتِ اسلام'' پڑھتے ہوئے حضرت سیدنا شیخ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی دماغ کی سکرین پر نمودار ہونے لگتا ہے کہ...... ''پاکانِ امت کے الفاظ خدا کی فوج کے لشکری ہوتے ہیں''...... واقعی سچ ہے کہ اللہ والوں کا ذکر گناہوں کا کفارہ اور خدا کے ساتھ تعلق کی رسی کو مضبوط کرنے کا بہانہ ہوتا ہے۔

سعیدی صاحب نے بہت اچھا کیا کہ شخصیات اسلام کے ذکرِ خیر سے اپنے قلم و قرطاس کو منور کیا اور اپنے قارئین کے لئے وادیٔ ایمان اور چمنِ ایقان میں بہاروں کا اہتمام کیا۔

صلاح الدین سعیدی سنجیدہ اور متین موضوعات کا انتخاب کر کے نہایت متانت و محنت سے ان پر لکھنے کی مشق کے عادی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل اُن کے قلم سے تقریباً دو درجن کتابیں نکل چکی ہیں اور ماشاء اللہ مقبولیت کی حدوں کو چھو رہی ہیں جو بجائے خود ان کی قبولیت کی دلیل ہے۔ میرے لئے خوشی کا باعث ہے کہ اس نئی کاوش پر میں محترم سعیدی صاحب کو ہدیۂ مبارکباد پیش کروں۔

میری رائے میں اس کتاب کو ہر ذی شعور کے زیرِ مطالعہ رہنا چاہیے تاکہ اس معاشرے اور سماج کا رشتہ اکابر و مشاہیر سے مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔ میں ان کے علمی، تحقیقی، تصنیفی سفر کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں...... حق تعالیٰ جل شانہٗ ان کے علم و قلم میں اپنی خاص برکتیں شامل کرے اور ان کے لیے بابِ مدینۃ العلم سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے فیضان کے دروازے کھول دے (آمین)

ملک محبوب الرسول قادری

(ایڈیٹر: ماہنامہ ''سوئے حجاز'' لاہور)

اسلامک میڈیا سنٹر لاہور